www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ

Al-Risala

January-February 2026 • Rs. 50

امن دانش مندوں کا طریقہ ہے
اور تشدد نادانوں کا طریقہ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Jan-Feb 2026 | Volume 51 | Issue 1

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr. Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: info@goodwordbooks.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹50 per copy
Subscription by Book Post	₹250 per year
Subscription by Regd. Post	₹450 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109

UPI
UNIFIED PAYMENTS INTERFACE

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

حاصلِ زندگی	4	کیوں یہ عمومی بے خبری	24
سائرن بج گیا	6	قساوت کیا ہے	26
خالق کی معرفت	7	امانی اور فکری زوال	27
خالق کی طرف واپسی	8	کشمیر کا خواب	29
شرک، توحید	9	تشدد کی تزئین	30
سورۃ الانشراح	10	انسان، اعلیٰ انسان	31
حسنِ رفاقت کا معاشرہ	11	تسبیح فاطمہ	33
تواضع کی صفت	12	ذکرِ جاری	34
شر میں خیر	13	علمی اسلوب،	
کوئی مصیبت، مصیبت نہیں	14	اکیڈمک اسلوب	35
کامیاب انسان	15	دس اسلامی اصول	36
جنگ کا حکم	16	ڈائری 1986	37
مثبت ذہن کے ساتھ جینا	17	ایک انٹرویو	41
خون کا رشتہ	18	غیر نزاعی طریقِ کار	45
خطرات، خطرات، خطرات	19	دوہرا خسارہ	46
حدیث اور قرآن	20	تشبّہ بالکفار	47
اجتہاد کیا ہے	21	زندگی کی تلخیاں	48
اجتہاد کی ضرورت	22	خبر نامہ اسلامی مرکز	49

اسلامی نکاح	1
علم کا صدقہ	4
اللہ کے یہاں گھمنڈ کی معافی نہیں	5
عورت جنگ میں	6
اس میں سبق ہے	8
مانوتا کا سمّان	12
سادا زندگی	13
آخرت کا ذکر آتے ہی اپنا دعوا چھوڑ دیا	16

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

حاصلِ زندگی

24 نومبر 2025 کو بالی وڈ کے مشہور اداکار دھرمیندر (پیدائش 8 دسمبر 1935) کا انتقال ہوگیا۔ بی بی سی اردو کی ویب سائٹ نے ان کی وفات کی خبر دیتے ہوئے پہلا جملہ یہ لکھا ہے: انڈین سینما کے 'ہی مین' کہے جانے والے اداکار دھرمیندر 89 برس کی عمر میں وفات پا گئے ہیں۔

این ڈی ٹی وی نے اپنے یوٹیوب چینل پر ان کا آخری ویڈیو پیغام (25 نومبر 2025) نشر کیا ہے، جو انھوں نے اپنے مداحوں کو دیا تھا۔ چینل نے اس کو حسبِ ذیل عنوان دیا:

Dharmendra's Last Video Message

38 سیکنڈ کی ویڈیو میں ان کا پیغام یہ ہے: "دوستو،

سب کچھ پا کر بھی حاصلِ زندگی کچھ بھی نہیں کمبخت جان کیوں جاتی ہے جاتے ہوئے

پتا نہیں کہاں لے جائیں گے، کون لے جائے گا، کیسے ساتھ لے جائیں گے، بہر حال، ہیومن نیچر ہے اکٹھا کرتے رہو، اپنے آپ سے محبت کرو، اپنا خیال رکھو اور زندگی کو انجوائے کرو"۔

No one knows where we will be taken, who will take us, or how we will be taken. In any case, it is human nature to keep accumulating. So, love yourself, take care, and enjoy life.

انسان اپنی ساری عمر خوشی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ہر عورت اور ہر مرد چاہتا ہے کہ وہ زندگی کو انجوائے کرے، اس کو ایسی خوشی حاصل ہوجائے، جس کے بعد کوئی غم نہ ہو۔ مگر عملی صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ انتہائی کوشش کے باوجود اس کا سفر ایک ناخوشی سے دوسری ناخوشی کی طرف جاری رہتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا معاملہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی اندرونی آواز اسے ایک مستقل اندیشے میں مبتلا رکھتی ہے: مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ یہ وہ سوال ہے جو دل کی گہرائیوں میں بے چینی پیدا کرتا رہتا ہے۔

انسانی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا اس لیے نہیں بنائی گئی کہ انسان کو یہاں کامل خوشی (happiness) حاصل ہو۔ اسی لیے آخر میں اس کے پاس جو کچھ رہ جاتا ہے، اسے دھرمیندر کی ایک فلم میں یوں بیان کیا گیا ہے: کچھ پانے کی چاہ، کچھ اور بہتر کی تلاش بی اسی چکر میں انسان اپنا سب کچھ کھو دیتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے۔ تلاش کبھی ختم نہیں ہوتی، وقت ختم ہوجاتا ہے۔ (بی بی سی اردو، 24 نومبر 2025)

انسانی تاریخ میں کوئی انسان فطری قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ اس سلسلے میں امریکا کے مشہور مشنری بلی

گراہم (1918-2018) نے چند حقیقی مثالوں کا ذکر کیا ہے، جو گویا پوری انسانی تاریخ کی ترجمانی ہے:

A french philosopher once said, "The whole world is on a mad quest for security and happiness." A Texas millionaire confided, "I thought money could buy happiness—I have been miserably disillusioned." A famous film star broke down: "I have money, beauty, glamour, and popularity. I should be the happiest woman in the world, but I am miserable. Why?" One of Britain's top social leaders said, "I have lost all desire to live, yet I have everything to live for. What is the matter?" A man went to see a psychiatrist. He said, "Doctor, I am lonely, despondent, and miserable. Can you help me?" The psychiatrist suggested that he go to a circus and see a famous clown who was said to make even the most despondent laugh with merriment. His patient said, "I am that clown." A college senior said, "I am twenty-three. I have lived through enough experiences to be old, and I am already fed up with life." A famous Grecian dancer of a generation ago once said, "I have never been alone but that my hands trembled, my eyes filled with tears, and my heart ached for peace and happiness I have never found." (*The Secret of Happiness* by Billy Graham, ch. The Search for Happiness)

اس دنیا میں کسی کو بھی حقیقی معنوں میں خوشی حاصل نہیں۔ یہاں تک کہ بظاہر خوشی میں جینا بھی انسان کو بورڈم کا شکار بنا دیتا ہے، جو اپنے آپ میں بے خوشی کا ظاہرہ ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اصل یہ ہے کہ منصوبۂ تخلیق کے مطابق، ہر انسان کے لیے موجودہ دنیا میں حاصلِ زندگی یہی ہے کہ وہ ایسا سرمایہ جمع کرنے کی منصوبہ بندی کرے جو نہ صرف اسے اس دنیا میں ایک اچھا انسان بنائے، بلکہ اس نامعلوم اگلی دنیا میں بھی اسے ایک اچھے انسان کی حیثیت عطا کرے۔ موت اس حقیقت کا اعلان ہے کہ آپ ایک ایسے مقام کی طرف جانے والے ہیں جسے آپ ابھی تک بالکل بھی نہیں جانتے۔ بڑھاپا، بیماری اور دیگر کمزوریاں اس اٹل فطری قانون کی جبری یاددہانی ہیں۔ یعنی موت کے بعد ہمیں یقیناً ایک انتہائی نامعلوم مقام کی طرف لے جایا جائے گا، اس سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ عقل مند وہ نہیں جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ حاصل کرلے۔ دوراندیش وہ ہے جو یہ سوچ کر زندگی گزارے کہ مرنے کے بعد اسے کن چیزوں کی ضرورت ہوگی، اور وہ اسی حساب سے اپنا سرمایہ اکٹھا کرے۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

سائرن بج گیا

29 اگست 2010 (18 رمضان 1431 ہجری) کو افطار کا وقت 6 بج کر 50 منٹ پر تھا۔ ٹھیک وقت پر قریب کی مسجد سے سائرن کی آواز آئی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ سائرن اس لیے بجا ہے کہ لوگ روزہ توڑ کر اب کھانا پینا شروع کر دیں۔ ایک وقت آنے والا ہے، جب کہ ایک اور سائرن یہ بتانے کے لیے بجے گا کہ لوگو، بس اب کھانے پینے کا وقت ختم ہو گیا۔ ہر چیز چھوڑ کر میدان حشر کی طرف دوڑو۔ اب تک کھانا پینا سب کو مل رہا تھا، مگر اب کھانا پینا صرف اس انسان کو ملے گا جو خدائی امتحان میں کامیاب رہا۔

مومن وہ ہے جس کے اندر آخرت رخی (akhirah-oriented) سوچ پیدا ہو جائے۔ جب کسی انسان کے اندر اس قسم کی سوچ پیدا ہو جائے تو اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں اس کو آخرت کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے۔ زندگی کا ہر تجربہ اس کے لیے آخرت کی یاد دہانی بن جاتا ہے۔ جسمانی طور پر موت سے پہلے کی دنیا میں رہتے ہوئے نفسیاتی طور پر وہ موت کے بعد آنے والی دنیا کا باشندہ بن جاتا ہے۔

یہی کیفیت کسی انسان کے لیے اس کی روحانی ترقی کی ضامن ہے۔ کسی آدمی کی روحانی ترقی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کو مسلسل طور پر روحانی غذا ملتی رہے۔ یہ روحانی غذا آدمی کو کسی خلا میں نہیں ملتی، یہ روحانی غذا اسی مادی دنیا میں ملتی ہے۔

روزانہ کا تجربہ ہے کہ آدمی مادی غذا کھاتا ہے، اور وہ جسم کے اندر داخل ہو کر خون بن جاتی ہے۔ اسی طرح آدمی کو اپنے اندر صلاحیت پیدا کرنا چاہیے کہ مادی تجربات اس کے اندر روحانی سبق میں ڈھل جائیں۔ یہ صلاحیت روحانی ترقی کی لازمی شرط ہے۔ یہ صلاحیت کسی آدمی کے اندر شعوری عمل کے ذریعے پیدا ہوتی ہے، وہ کبھی پراسرار طور پر پیدا نہیں ہوتی۔

خالق کی معرفت

کائنات کے سائنسی مطالعہ معلوم ہوتا ہے کہ مائنڈ بالگلنگ سطح پر اس نظام قائم ہے۔ اس کے مطالعہ کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ انسان اس حقیقت کو دریافت کرے کہ اس کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا اور چلانے والا ضرور موجود ہے، جو اس بے حد وسیع اور پیچیدہ کائناتی نظام کو انتہائی اعلی درجہ کی حکمت کے ساتھ چلا رہا ہے۔ اس کے باوجود انسانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ انسان جس حقیقت سے سب سے زیادہ ناواقف اور بے خبر رہا ہے، وہ خالقِ کائنات کی معرفت ہے۔ اس حقیقت کو مالک بن دینار تابعی (وفات 127ھ) نے درست طور پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے: خَرَجَ أَهْلُ الدُّنْيَا مِنَ الدُّنْيَا وَلَمْ يَذُوقُوا أَطْيَبَ شَيْءٍ فِيهَا۔ قَالُوا: وَمَا هُوَ يَا أَبَا يَحْيَى؟ قَالَ: مَعْرِفَةُ اللّٰهِ تَعَالَى (حلیۃ الأولیاء، جلد 2، صفحہ 357)۔ یعنی، اہل دنیا دنیا سے چلے گئے، اور اس کی سب سے پاکیزہ چیز کو نہیں چکھا، لوگوں نے پوچھا، وہ کیا ہے، اے ابو یحییٰ، انھوں نے جواب دیا: اللہ کی معرفت۔

اللہ کا راستہ صراطِ مستقیم کہلاتا ہے، یعنی درست راستہ۔ جو انسان صراطِ مستقیم کو پہچان کر اس پر ثابت قدمی کے ساتھ چلتا رہے، وہ گمراہی سے محفوظ رہے گا۔ اس لیے ہر انسان کا پہلا اور بنیادی کام یہ ہے کہ وہ صراط مستقیم اور غیر صراطِ مستقیم کی درست پہچان حاصل کرے۔ یعنی صحیح اور غلط کے امتیاز کے ساتھ زندگی کا سفر طے کرے۔ جو شخص اس پہچان سے محروم رہ جاتا ہے، وہ زندگی کے مختلف راستوں میں بھٹکتا رہتا ہے، حالاں کہ وہ اس گمان میں رہتا ہے کہ وہ درست اور مطلوب راستے پر چل رہا ہے۔

جو آدمی معرفت کی منزل تک پہنچنا چاہتا ہے، اس کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ معرفت کے راستے کا نقطۂ آغاز کیا ہے۔ صحیح نقطۂ آغاز سے اپنا سفر شروع کرنے والا منزل پر پہنچے گا، اور جو شخص صحیح نقطۂ آغاز کی پہچان سے محروم رہے، وہ ہمیشہ مختلف راستوں میں بھٹکتا رہے گا، اور صحیح منزل سے محروم رہے گا۔ آدمی کو اس سے بچنا چاہیے کہ وہ ہر کھلے راستے پر چل پڑے، اور آخر میں اس کا انجام یہ ہو کہ وہ کبھی اپنی منزل مقصود پر نہ پہنچے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے سفر کا آغاز صحیح اور غلط کی پہچان سے شروع کرے اور اس کا سرا خدا کی معرفت ہے۔

خالق کی طرف واپسی

قرآن میں زندگی کی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى، وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَى، ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَى، وَأَنَّ إِلَى رَبِّكَ الْمُنْتَهَى (53:39-42)۔ یعنی، انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کمایا، اور یہ کہ اس کی کمائی عنقریب دیکھی جائے گی، پھر اس کو پورا بدلہ دیا جائے گا، اور یہ کہ سب کو تمہارے رب تک پہنچنا ہے۔

اللہ رب العالمین نے انسان کو ایک منصوبہ کے تحت پیدا کیا، اور اس کو زمین جیسے استثنائی کرہ پر آباد کیا۔ زمین سولر سسٹم کا ایک پارٹ ہے۔ اس دنیا میں ہر چیز کسٹم میڈ (custom-made) انداز میں بنائی گئی، اور یہاں انسان کو پوری آزادی دی گئی۔ یہاں کے ماحول میں فرشتوں کی نگرانی میں ان افراد کا انتخاب کیا جارہا ہے، جو خالق کے تخلیقی پلان کو سمجھیں، اور اس کے مطابق، سیلف ڈیسپلنڈ لائف (self-disciplined life) گزار کر اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ جنت کی ابدی دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہیں۔

خالق کے تخلیقی نقشے کے مطابق، یہ ایک فطری حقیقت کا معاملہ ہے۔ لیکن کچھ لوگوں نے اس کو شاعرانہ تعبیر کے ذریعے رومانٹک تخیل بنا دیا۔ مثلاً فخر الدین عراقی (592-688 ھ) ایک فارسی صوفی شاعر اور فلسفی تھا۔ وہ ایران میں پیدا ہوا اور شام میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کی ایک نظم کا ایک شعر یہ ہے:

بہ طواف کعبہ رفتم بہ حرم رہم ندادند　　کہ برون در چہ کردی، کہ درون خانہ آیی؟

یعنی میں کعبہ کے طواف کے لیے گیا، مگر مجھ کو اس میں داخلے کی راہ نہیں ملی، اور آواز آئی کہ باہر تم نے کیا کیا ہے کہ اندر آنے کی کوشش کررہے ہو۔ اس شعر میں شاعر نے ایک عبادتی معاملے کو رومانٹک تصور کے روپ میں ڈھال دیا ہے۔ عبادت ایک حقیقی تجربہ ہے۔ اس حقیقت کو شاعر نے رومانی تخیل کی زبان میں بیان کیا ہے۔

شرک، توحید

شرک اور توحید کو عام طور پر بتوں کو پوجنے یا نہ پوجنے تک محدود سمجھ لیا جاتا ہے۔ جو آدمی بظاہر بت کو پوجے، وہ مشرک ہے اور جو آدمی بظاہر بت کو نہ پوجے، وہ موحّد ہے۔ مگر یہ شرک اور توحید کا ایک بے حد کم تر اندازہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شرک کا تعلق انسان کی گہری نفسیات سے ہے۔ انسان خود اپنی نفسیات کی سطح پر مشرک یا موحد بنتا ہے، نہ کہ کسی خارجی مجسمے کی سطح پر۔

اصل یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک انتہائی طاقتور طاقت ور جذبہ ہے۔ یہ محبت کا جذبہ موجود ہے، یعنی کسی کے لیے اسٹرانگ افکشن (strong affection) کا ہونا۔ اِس شدید جذبۂ محبت کو انسان اگر کسی غیر خدا کے ساتھ وابستہ (associate) کرے تو وہ شرک ہے، اور اگر وہ اِس جذبے کو اللہ کے ساتھ مخصوص کر دے تو وہ توحید ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے۔ جو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (2:165)۔ یعنی، کچھ لوگ ایسے ہیں۔ جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ وہ اُن سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسی محبت اللہ سے رکھنا چاہیے۔ اور جو اہل ایمان ہیں، وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔

اللہ سے حبِّ شدید (strong affection) اصلاً ایک قلبی حالت کا نام ہے۔ تاہم اس کے کچھ خارجی مظاہر ہیں۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ ایسا آدمی اللہ سے اپنے شدتِ تعلق کی بنا پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ بار بار اللہ کا چرچا کرے۔ اس کی مجلس میں گہری کیفیت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتا رہے۔ اس کے دماغ میں ایسا فکری بھونچال جاری رہے، جو ایک انفجار (explosion) بن کر لفظوں میں ظاہر ہو جائے — یہ گہرا قلبی تعلق اگر کسی غیر اللہ سے ہو تو وہ شرک ہے اور اگر وہ اللہ سے ہو تو اِسی کا نام توحید ہے۔ آخرت میں مشرک کے لیے جہنم ہے اور موحد کے لیے جنت۔

سورۃ الانشراح

قرآن کی سورۃ الانشراح (94) کا ترجمہ یہ ہے: "کیا ہم نے تمھارا سینہ تمھارے لیے کھول نہیں دیا۔ اور تمھارا بوجھ اتار دیا، جس نے تمھاری پیٹھ جھکا دی تھی۔ اور ہم نے تمھارا ذکر بلند کیا۔ پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ پھر جب تم فارغ ہو جاؤ تو محنت کرو۔ اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھو"۔

قرآن کی اِس سورہ کو عام طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی فضیلت کے معنی میں لیا جاتا ہے۔ ایک مفسر قرآن لکھتے ہیں: سورةُ الشَّرْحِ سورةٌ مَكِّيَّةٌ، تَتَحَدَّثُ عَنْ مَكانَةِ الرَّسولِ الجَليلَةِ، وَمَقامِهِ الرَّفيعِ عِندَ اللّٰهِ تَعالى (تفسیر القرآن العظیم، عم لعبد الملک القاسم، صفحہ 125)۔ یعنی، سورۃ الانشراح ایک مکی سورہ ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم مقام اور مرتبے کو بیان کرتی ہے، جو آپ کا اللہ کے نزدیک ہے۔

مگر یہ بات درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی اِس سورہ میں پیغمبر اسلام کے حوالے سے اللہ کی ایک عمومی رحمت کو بیان کیا گیا ہے۔ جب ایک انسان سچائی کا متلاشی (seeker) بنتا ہے، پھر وہ سچائی کو دریافت کرتا ہے، اس کو اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے، ذکر و دعا کے ذریعے وہ اللہ سے تعلق قائم کرتا ہے۔ اُس وقت ایک سچے انسان کو اعلیٰ معرفت کی صورت میں جو رحمتیں حاصل ہوتی ہیں، اُن کو اِس سورت میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس رحمت کے پانچ پہلو ہیں:

1۔ فکری وضوح	(clarity of thought)
2۔ معاملات کو مثبت انداز میں دیکھنا	(positive approach)
3۔ مسائل کے بجائے مواقع پر دھیان دینا	(focussing on opportunity)
4۔ اپنے اوقاتِ کار کی تنظیم	(time management)
5۔ خدارخی ذہن	(God-oriented man)

اِن پانچ صفات کے ساتھ جو شخصیت بنے، اس شخصیت کا شرعی نام مومن اور مسلم ہے۔

حسنِ رفاقت کا معاشرہ

جنت کیا ہے۔ جنت کے بارے میں قرآن میں آیا ہے: وَاللّٰهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ (10:25)۔ یعنی، اور اللہ امن کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ اس حقیقت کو جنت کے حوالے سے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا ۔ إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا (56:25-26)۔ یعنی، اس میں وہ کوئی لغو اور گناہ کی بات نہیں سنیں گے۔ مگر صرف سلام سلام کا بول۔

قرآن کی ان آیات پر غور کرنے سے جنت کی جو تصویر بنتی ہے، وہ یہ ہے کہ جنت حسنِ رفاقت کا معاشرہ ہوگا (النساء، 4:69)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں مکمل طور پر امن کا ماحول ہوگا۔ اس لیے جنت میں وہی لوگ جگہ پائیں گے، جو دنیا کی زندگی میں یہ ثابت کر چکے ہوں کہ وہ حقیقی معنوں میں اپنے سماج کے پُرامن شہری بن کر رہ سکتے ہیں۔

جنت میں بسانے کے لیے ایسے لوگ منتخب کیے جائیں گے، جو دنیا کی زندگی میں یہ ثابت کر چکے ہوں کہ وہ پورے معنی میں اعلیٰ کردار کے حامل ہیں، جو دنیا کی زندگی میں دوسرے انسانوں کے ساتھ حسن رفاقت کا معاملہ کریں، جن کا حال یہ ہو کہ ان کے دلوں میں دوسرے انسانوں کے لیے امن اور خیر خواہی کے جذبات کے سوا کچھ اور نہ ہو۔

موجودہ دنیا جنت کے لیے اہلیت ثابت کرنے کا مقام ہے، یعنی یہ ثابت کرنے کا مقام کہ اس دنیا کی زندگی میں کوئی انسان خدا اور اس کے بندوں کے ساتھ کس طرح زندگی گزارتا ہے۔ جو انسان اپنے آپ کو اس امتحان میں کامیاب کرے گا، وہی وہ انسان ہے، جو جنت کا مستحق ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ دو صفات سب سے زیادہ انسانوں کے جنت میں داخلہ کا سبب بنیں گے، تقویٰ اور حسنِ اخلاق (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2004)۔ تقوی نام ہے، اللہ سے قربت کا، اور حسنِ اخلاق نام ہے اس بات کا کہ آدمی دنیا میں سلف ڈسپلن (self-discipline) کی زندگی گزارے۔ وہ سماج میں ایک نو پرابلم (no problem) انسان بن کر رہے۔

تواضع کی صفت

تواضع (modesty) موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ قدر انسانی صفت ہے۔ اس سلسلے میں پیغمبر اسلام کی اہلیہ عائشہ (وفات 57ھ) کا ایک بامعنی قول ان الفاظ میں آیا ہے: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: إِنَّكُمْ لَتَدَعُونَ أَفْضَلَ الْعِبَادَةِ التَّوَاضُعَ (مصنف ابن ابی شیبۃ، حدیث نمبر 34739)۔ یعنی، عائشہ نے کہا: بے شک تم لوگ ترک کرتے ہو افضل عبادت کو، یعنی تواضع۔

تواضع (modesty) دراصل اس صفت کا نتیجہ ہے، جو اپنی حقیقتِ واقعی کو سمجھنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ تواضع تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس کے برعکس، دوسری صفت یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو حقیقت واقعہ سے زیادہ سمجھے۔ اس کو فخر کہتے ہیں۔ کسی آدمی کو پہچاننا ہو تو دو چیزوں کے ذریعے اس کی شخصیت کو پہچانا جاسکتا ہے۔ جس آدمی کے اندر فخر کی نفسیات ہو، وہ ہر اعتبار سے ایک غیر مطلوب شخصیت کا حامل ہوگا، اور جس آدمی کے اندر تواضع کی نفسیات ہو، اس کی شخصیت کے اندر تمام مطلوب اوصاف پائے جائیں گے۔ جس آدمی کے اندر تواضع کی نفسیات پائی جائے، اس کا حال یہ ہوگا کہ وہ ہر چیز کو خدا کی نسبت سے دیکھے گا، نہ کہ انسان کی نسبت سے۔

کوئی آدمی ماڈسٹ (modest) کیسے بن سکتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ آدمی اپنے احتساب کا زیادہ سے زیادہ شائق بن جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر تعلم (learning) کی صفت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ کسی نفسیاتی رکاوٹ کے بغیر دوسروں سے سیکھنے لگتا ہے۔ کسی قسم کی بڑائی کا جذبہ اس کے لیے ذہنی ترقی میں رکاوٹ نہیں رہتا۔ وہ اتنا زیادہ متلاشی (seeker) بن جاتا ہے کہ جب بھی کوئی وزڈم کی بات اس کے سامنے آتی ہے، تو وہ کسی رکاوٹ کے بغیر فوراً اس کو قبول کرلیتا ہے۔

تواضع (modesty) انسان کی بنیادی اخلاقی صفت ہے۔ جس آدمی کے اندر ماڈسٹی ہوگی، اس کے اندر بقیہ تمام اخلاقی صفات ضرور موجود ہوں گے، اور جس آدمی کے اندر ماڈسٹی کی صفت نہ ہو، تو وہ یقینی طور پر دوسرے تمام اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے خالی ہوگا۔

شر میں خیر

5 ہجری میں وہ واقعہ پیش آیا جس کو افک کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ناخوش گوار واقعہ تھا۔ اس کی تفصیل قرآن کی سورۃ النور (24:11-21) اور حدیث اور سیرت کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اِس ناخوش گوار واقعے کے تذکرے کے ذیل میں ایک حکمانہ نصیحت ان الفاظ میں آئی ہے: لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (24:11)۔ یعنی، تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو، بلکہ یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔

قرآن کی اِس آیت کا تعلق صرف افک کے واقعے سے نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ایک اصولی اور آفاقی تعلیم دی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اِس دنیا کو بنانے والے نے اُس کو اِس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی شر (ناموافق صورتِ حال) صرف شر نہیں، بلکہ اِس دنیا میں ہر شر کے اندر ایک خیر (موافق صورتِ حال) کا پہلو چھپا ہوا ہے:

There is good in every evil.

قدیم مدینہ میں افک کا جو واقعہ پیش آیا، وہ بظاہر شر کا ایک واقعہ تھا، مگر اُس میں خیر کا ایک پہلو چھپا گہرائی کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ یہ کہ اس کی وجہ سے مدینہ اور اطرافِ مدینہ میں اسلام اور پیغمبر اسلام کا چرچا بہت بڑھ گیا۔ پروپیگنڈے کی اِس فضا کے دوران لوگوں کے اندر اسلام کے بارے میں بڑے پیمانے پر تجسس (curiosity) کا مزاج پیدا ہوا۔ لوگ چاہنے لگے کہ وہ جانیں کہ اسلام کیا ہے اور پیغمبر اسلام کا مشن کیا ہے۔ یہ گویا اسلام کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ایک نیا موقع تھا۔ اہل ایمان نے اِس موقع کو پرامن طور پر استعمال کیا، یہاں تک کہ اسلام کا دائرہ بہت زیادہ بڑھ گیا۔

یہی صورتِ حال آج بھی ساری دنیا میں پائی جاتی ہے۔ موجودہ زمانہ میڈیا کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا ہے۔ اِس پروپیگنڈے نے موجودہ زمانے میں اسلامی دعوت کے لیے عظیم مواقع پیدا کر دیے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اِن مواقع کو پرامن انداز میں بھرپور طور پر استعمال کیا جائے۔

کوئی مصیبت، مصیبت نہیں

غزوۂ احد 3 ھ میں پیش آیا۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کو جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ غزوہ احد کے ذیل میں کتابوں میں بہت سے واقعات آئے ہیں، ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے: مَرَّ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بِامْرَأَةٍ مِنْ بَنِي دِينَارٍ، وَقَدْ أُصِيبَ زَوْجُهَا وَأَخُوهَا وَأَبُوهَا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بِأُحُدٍ، فَلَمَّا نُعُوا لَهَا، قَالَتْ: فَمَا فَعَلَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم؟ قَالُوا: خَيْرًا يَا أُمَّ فُلَانٍ، هُوَ بِحَمْدِ اللّٰهِ كَمَا تُحِبِّينَ، قَالَتْ: أَرُونِيهِ حَتَّى أَنْظُرَ إِلَيْهِ؟ قَالَ: فَأُشِيرَ لَهَا إِلَيْهِ، حَتَّى إِذَا رَأَتْهُ قَالَتْ: كُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ! (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 99)۔ یعنی، رسول اللہ ﷺ انصار کے قبیلہ بنو دینار کی ایک عورت کے پاس سے گزرے، جس کے شوہر اور بھائی اور باپ احد کے دن رسول اللہ کی طرف سے قتل ہو گئے تھے۔ جب اس کو ان تینوں کے موت کی خبر پہنچی تو اس نے کہا: رسول اللہ کا کیا ہوا۔ لوگوں نے کہا کہ الحمدللہ، وہ اچھے ہیں اے ام فلاں، جیسا کہ تم پسند کرتی ہو۔ اس عورت نے کہا: مجھے دکھاؤ، تا کہ میں ان کو دیکھ لوں۔ لوگوں نے اس عورت کو آپ کی طرف اشارہ کیا، یہاں تک کہ اس نے آپ کو دیکھا، اور کہا: آپ کے بعد ہر مصیبت چھوٹی ہے۔

جس شخص کو اسلام کی سچائی ایک دریافت کے طور پر حاصل ہو جائے، اسے ایسی حقیقت ملتی ہے جو اس کے نزدیک تمام حقیقتوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ وہ چھوٹی باتوں سے اٹھ کر زیادہ بڑی بات میں جینے لگتا ہے۔ ایسا آدمی اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ اگر اس پر کوئی اُفتاد پڑے تو وہ اس کو معتدل انداز میں برداشت کر لے۔ وہ یہ کہہ سکے کہ چھوٹی مصیبت پیش آئی تو کوئی حرج نہیں۔ بڑا سرمایہ تو ابھی میرے پاس موجود ہے۔

انسان کے اندر یہ ذہن کیسے بنے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی حقیقت پسند بنے۔ وہ چھوٹی باتوں سے اوپر اٹھ کر زیادہ بڑی بات میں جینے والا بن جائے۔ اسی کو حقیقت پسندانہ طرز فکر (realistic approach) کہا جاتا ہے۔

کامیاب انسان

کامیاب انسان کون ہے۔ کامیاب انسان کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر مستقبل بینی کی صفت پائی جائے، اور مستقبل بینی کثرتِ مطالعہ اور کثرتِ غور وفکر سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً رسول اللہ نے اپنی تحریک میں کئی بار ایسا کیا کہ بظاہر پسپائی کا طریقہ اختیار کیا۔ کیوں کہ آپ کی مستقبل بینی نے آپ کو بتایا کہ بظاہر وقتی پسپائی میں آپ کے لیے پیش قدمی کا راستہ کھلے گا۔

مثال کے طور پر پیغمبر اسلام ﷺ نے تیرہ سال تک مکہ میں اپنا دعوتی مشن چلایا۔ لیکن معاملہ جب خراب ہونے لگا، یعنی مکہ میں آپ کا رہنا دشوار ہو گیا تو آپ نے مکہ سے ہجرت کا راستہ اختیار کیا۔ اس کے بعد جب آپ مدینہ آ گئے تو یہاں بھی اہل مکہ نے آپ کو جنگ میں الجھانا چاہا۔ لیکن آپ نے دوبارہ حدیبیہ کے مقام پر یک طرفہ طور پر فریقِ ثانی کی شرطوں کو مان کر ان سے دس سالہ ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ اس سے تعارفِ اسلام کا میدان آپ کے لیے پوری طرح کھل گیا۔ اس کے بعد جو نتیجہ سامنے آیا، وہ اسلامی تاریخ میں فتح مبین (الفتح، 48:1) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی کھلی فتح۔

مستقبل بینی کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے اندر آبجیکٹیو تھنکنگ (objective thinking) موجود ہو۔ آبجیکٹیو تھنکنگ کا مطلب ہے — جذبات کی بنیاد پر چیزوں کو دیکھنے کے بجائے حقائق کی بنیاد پر چیزوں کو دیکھنا:

> When you do something objectively, you do it with an open mind, considering the facts rather than your personal feelings.

آبجیکٹیو تھنکنگ سے دوری کا سب سے بڑا سبب کسی چیز کے بارے میں غلو آمیز تصور رکھنا ہے۔ یعنی کنڈیشنڈ مائنڈ کے ساتھ چیزوں کو دیکھنا۔ اس قسم کا انحراف یا ڈسٹریکشن (distraction) کسی انسان کے لیے بے حد سنگین ہے۔ وہ انسان کو اس صفت سے محروم کر دیتا ہے کہ وہ چیزوں کو ایز اٹ از (as it is) دیکھ سکے، وہ چیزوں کو مواقع کے اعتبار سے دیکھنے کے بجائے مسائل کے اعتبار سے دیکھنے لگتا ہے۔ جب کہ کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ انسان مواقع کو اَویل کرے۔

جنگ کا حکم

قرآن میں ایک آیت آئی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے: تم کو جنگ کا حکم ہوا ہے اور وہ تم کو گراں معلوم ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لیے بھلی ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے (2:216)۔

فقہائے اسلام کے نزدیک اسلام میں جنگ کی حیثیت حسن لغیرہ کی ہے، نہ کہ نماز و روزہ کی مانند کوئی ابدی شریعت۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ ساتویں صدی سے پہلے، جب اسلام آیا، تاریخ میں صدیوں کے اثر سے ایک غلط رواج قائم (establish) ہو چکا تھا۔ طویل تاریخی روایت کے نتیجے میں مذہب لوگوں کے لیے سیاسی وفاداری کا معیار بن چکا تھا، یعنی جو شخص حاکم کے مذہب پر ہوتا، وہ ریاست کا وفادار سمجھا جاتا، اور جو حاکم کے مذہب پر نہ ہوتا، وہ ریاست کا وفادار بھی نہیں مانا جاتا تھا۔ اسی بنیاد پر یہ ایک مبرر حکم (justified act) بن گیا تھا کہ حاکمِ وقت کے مذہب سے انحراف کرنے والے کو قتل کر دیا جائے، یا ایسے لوگوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کر کے ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اسی رواج کے نتیجے میں سماج میں وہ سنگین برائی پیدا ہوئی جسے مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا ہے۔

اسلام میں جب جنگ کا حکم آیا تو جو لوگ اس معاملے کو گہرائی کے ساتھ نہیں سمجھ رہے تھے، ان کے لیے یہ ایک کُرہ (ناگواری) کا معاملہ تھا (البقرۃ، 2:216)۔ حالانکہ یہ ایک وقتی رکاوٹ کو دور کرنے کا معاملہ تھا۔ اسلام نے یہ چاہا کہ سخت کارروائی (strong action) کے ذریعے ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ تاکہ اگلی نسلوں کے لیے امن اور آزادی کے ساتھ سچے مذہب کو چننے اور اس پر عمل کرنے کے مواقع حاصل ہو جائیں۔ اس کے نتیجے میں تاریخ میں ایک مستقل تبدیلی کا دور آنے والا تھا۔ اس کے نتیجے میں پہلی بار دنیا میں پرامن دور آنے والا تھا، اور ہمیشہ کے لیے کسی رکاوٹ کے بغیر عالمی سطح پر مذہب کے تعارف کا دروازہ کھلنے والا تھا۔ گویا کہ یہ جنگ، جنگ کے آغاز کے معنی میں نہیں تھی، بلکہ جنگ کے خاتمے کے معنی میں تھی۔

مثبت ذہن کے ساتھ جینا

مثبت نفسیات کے ساتھ جینا، ایک لفظ میں یہ ہے کہ آدمی دنیا میں اس یقین کے ساتھ جیے کہ اللہ رب العالمین اس کا خالق و مالک ہے، وہ رحیم و کریم ہے۔ وہ اپنے بندے کے ساتھ اس وقت بھی ہوتا ہے جب کہ کوئی دوسرا اس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ وہ اس وقت بھی اپنے بندے کا مددگار ہوتا ہے جب کہ کوئی انسان اس کی مدد کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

ایک مسلم نوجوان مجھ سے میرے آفس میں ملے۔ انھوں نے مجھ سے یہ شکایت کی کہ وہ فلاں مسلمان سے ملنا چاہتے تھے، لیکن ان کو وقت نہیں ملا۔ میں نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے سمجھایا کہ جب انسان سے آپ کو ملاقات کا وقت نہ ملے، تو آپ اللہ کو یاد کیجیے۔ آپ یہ کہیے کہ انسان سے اگر ملاقات نہیں ہوسکی، کوئی بات نہیں، اللہ تو ہر وقت ملاقات کے لیے موجود ہے۔ یہ سوچ آپ کے یقین کو بڑھائے گی۔ یہ سوچ آپ کے ذہنی ارتقا میں اضافہ کرے گی۔ آپ انسان کو کھو کر اللہ کو پالیں گے۔ آپ کی محرومی آپ کو ایک نئی دریافت تک پہنچادے گی۔ آپ کا کھونا، آپ کے لیے ایک نئی دریافت کا ذریعہ بن جائے گا۔

یہ صرف کسی سے ملاقات کی حد تک نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک معاملے میں آپ یہی سوچ اختیار کیجیے۔ مثلاً کسی نے آپ کو کوئی چیز نہیں دی تو آپ سوچیے کہ خدا دینے والا ہے، وہ ہر وقت دینے کے لیے موجود ہے، اس وقت آپ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے۔ منفی انداز میں سوچنا، آدمی کی محرومی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس، مثبت انداز میں سوچنا آدمی کی ذہنی اور روحانی ارتقا کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

ہر کھونے میں دوبارہ پانے کا راز چھپا ہوا ہے۔ انسان کو اللہ نے سوچنے کی طاقت دی ہے۔ یہ طاقت بلاشبہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ اپنے ذہن کو ہمیشہ زندہ رکھیے، اور آپ دیکھیں گے کہ آپ کا ذہن آپ کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اس سرمایہ سے بڑی چیز آپ کے لیے نہیں ہے۔ اس سرمایہ کو استعمال کیجیے، اور آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ذہنی سرمایے نے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا روحانی انسان بنادیا ہے۔

خون کا رشتہ

سماجی زندگی میں انسان کے لیے باہمی تعلق کا ایک نہایت طاقت ور محرک وہ ہے جسے خون کا رشتہ (blood relationship) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا تعلق ہے جو انسانوں کے درمیان ایک گہرا روحانی بندھن قائم کر دیتا ہے، جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ دوسرے تمام رشتے کسی نہ کسی شرط کے تحت قائم ہوتے ہیں، لیکن خون کا رشتہ واحد رشتہ ہے جو ہر شرط سے بالاتر ہوتا ہے۔ باقی تمام رشتے مفاد (interest) پر قائم ہوتے ہیں، جب کہ خون کا رشتہ ایسا تعلق ہے جو نسب کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، نہ کہ کسی مفاد پر۔

خون کا رشتہ خالق کی ایک ایسی نعمت ہے جو ناقابل فہم حد تک حیرت انگیز ہے۔ خون اپنے آپ میں ایک مادی چیز ہے، مگر خونی رشتے کے ساتھ جو جذباتی وابستگی، ہمدردی اور قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، وہ محض مادی توضیح سے بالاتر ہے۔ حیوانات کے اندر بھی خون پایا جاتا ہے، لیکن ان میں خونی رشتے کے ساتھ وابستہ یہ اخلاقی اور جذباتی شعور موجود نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر وہ انسانی معنوں میں خاندانی اور سماجی نظام قائم نہیں کر پاتے۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ حیوانات میں بھی خون اور جینیاتی ربط پایا جاتا ہے، لیکن ان کے درمیان انسانی سطح کا سماج اور اخلاقی نظام تشکیل نہیں پاتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان کے خالق نے انسان کو شعور، اخلاقی احساس اور معنوی اقدار عطا کی ہیں، جو خونی رشتے کو محض حیاتیاتی تعلق کے بجائے ایک بامعنی تعلق کی سطح پر پہنچا دیتی ہیں۔

خونی رشتہ اپنی پاکیزگی کے اعتبار سے ایک ملکوتی رشتہ ہے۔ تاہم خونی رشتے کے امکانات سے وہی شخص بھرپور فائدہ (avail) اٹھا سکتا ہے جو گہری معرفت کی سطح پر اس کی اہمیت کو دریافت کرے، جو شکایت کی نفسیات سے آزاد ہو کر خونی رشتے کی قدر کرنا جانتا ہو۔ خونی رشتے کی قدر کرنا درحقیقت رحمتِ خداوندی کی قدر کرنا ہے۔

خطرات، خطرات، خطرات

میں مسلمانوں کے ایک جلسے میں شریک ہوا۔ یہ تعلیم یافتہ افراد کا جلسہ تھا۔ ان کی تقریروں کا خلاصہ تھا— ہم خطرات سے گھرے ہوئے ہیں، ہم اپنے آپ کو محاصرے کے اندر (under siege) پاتے ہیں۔ ہم کو دشمن کی سازشوں کا سامنا ہے، وغیرہ۔

اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنی پوری لمبی عمر میں مَیں نے مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقے سے یہی باتیں سنی ہیں۔ اس مدت میں شاید مجھے کوئی نہیں ملا، جو پازیٹیو تھنکنگ کا حامل ہو، جو مثبت باتیں کرے، جو انسانی خطرات کے بجائے اللہ رب العالمین کی رحمتوں کو جانتا ہو، جو لوگوں کے درمیان حقیقی معنوں میں اللہ کی محبت کو بکھیرے، جو لوگوں کے درمیان اللہ کی خشیت کا چرچا کرے، جو لوگوں کو حقیقی معنوں میں جنت اور آخرت کا پیغام دے۔

مجھے اپنی زندگی میں ایسے بہت سے لوگ ملے، جو پیغمبر کا تذکرہ کرتے ہوئے رحمۃ للعالمین کا لفظ بولتے تھے، مگر مجھے یاد نہیں کہ مجھے اپنی زندگی میں ایسا کوئی شخص ملا ہے، جو حقیقی معنوں میں رحمۃ للعالمین کو ایک مثبت انقلابی تصور کے طور پر جانتا ہو، جس نے حالات کا ایسا تجزیہ کیا ہو کہ دنیا اس کو رحمت کی دنیا دکھائی دے، تاریخ اس کو رحمت کی تاریخ نظر آئے، جو لوگوں کو خوف کے بجائے امید کا پیغام دے، جو لوگوں کے اندر نفرت کے بجائے محبت کا چرچا کرے۔

مجھے اپنی لمبی عمر میں ایسے لوگ ملے، جو ردّ عمل (reaction) کی سوچ میں جینے والے تھے، شاید مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا، جو ردّ عمل کی نفسیات سے پاک ہو، جو خالص مثبت نفسیات میں جینے والا ہو۔ مجھے منفی باتیں کرنے والے ملے، لیکن مجھے مثبت باتیں کرنے والا کوئی نہیں ملا۔ مثبت طرزِ فکر فطرت کے نظام کے مطابق ہے۔ اس لیے مثبت طرزِ فکر سے زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، منفی طرزِ فکر سے زندگی کے تمام معاملات بگڑ جاتے ہیں۔ مثبت طرزِ فکر زندگی ہے، اور منفی طرزِ فکر ابدی ہلاکت۔ مثبت طرزِ فکر ربانی طرزِ فکر ہے، اور منفی طرزِ فکر طاغوتی طرزِ فکر۔

حدیث اور قرآن

قرآن میں وہ تمام حقیقتیں بیان کی گئی ہیں، جو انسان کی سعادت کے لیے ضروری ہیں۔ مگر یہ بیان، زیادہ تر، عمومی انداز میں ہے، وہ تعین اور تحدید (specification) کی زبان میں نہیں۔ اِس اعتبار سے، حدیث گویا کہ قرآن کا تکملہ (complement) ہے۔ حدیث میں قرآن کی عمومی تعلیمات کو محدّد زبان میں بیان کیا گیا ہے:

Hadith specifies the general teaching of Quran.

مثال کے طور پر قرآن کی سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا (33:41)۔ یعنی، اے ایمان والو، اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔ یہ آیت صرف ذکر کثیر کی تعلیم دیتی ہے، مگر ذکر کثیر کی عملی صورت کیا ہے، وہ قرآن کی اِس آیت سے معلوم نہیں ہوتی۔ قرآن ایک کتاب ہے، اِس لیے اُس میں کسی تعلیم کو صرف اصولی طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ کسی تعلیم کی عملی صورت کو ایک کتاب میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

اِس لیے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ رسول تمہارے لیے اسوہ ہیں (33:21)۔ اسوہ کا مطلب ہے عملی نمونہ (practical model)۔ چنانچہ قرآن کی مذکورہ تعلیم (ذکرِ کثیر) کا عملی ماڈل حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ اِس سلسلے میں حضرت عائشہ کی ایک روایت ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اُس روایت کے الفاظ یہ ہیں: كَانَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يَذْكُرُ اللَّهَ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 117)۔ یعنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کو ہر حین (occasion) پر یاد کرتے تھے۔ رسول اللہ کے اِس اسوہ سے قرآن کی مذکورہ آیت کا مفہوم واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ذکر کثیر کا مطلب کیا ہے۔ یعنی واقعات اور تجربات کو پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بنا کر اللہ کو یاد کرنا۔ واقعات اور تجربات آدمی کی زندگی میں ہر لمحہ پیش آتے رہتے ہیں۔ اِس بنا پر انسان کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ ہر لمحہ پیش آنے والے واقعات اور تجربات کے حوالے سے اللہ کو یاد کرتا رہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں ذکر کثیر کہا گیا ہے۔

اجتہاد کیا ہے

ابن الہمام الحنفی نے اجتہاد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: بَذْلُ الطَّاقَةِ مِنَ الْفَقِيهِ فِي تَحْصِيلِ حُكْمٍ شَرْعِيٍّ عَقْلِيًّا كَانَ أَوْ نَقْلِيًّا قَطْعِيًّا كَانَ أَوْ ظَنِّيًّا (الاجتہاد فی مناط الحکم الشرعی، بلقاسم بن ذاکر، صفحہ 32)۔ یعنی، فقیہ کا کوشش کرنا، کسی شرعی حکم کو حاصل کرنے کے لیے، خواہ وہ عقلی ہو یا نقلی، قطعی ہو یا ظنی۔

بظاہر یہ تعریف ایک وسیع تعریف ہے، لیکن یہ زیادہ واضح تعریف نہیں ہے۔ اجتہاد کی اصل یہ ہے کہ جہاں پر شرعی حکم براہ راست طور پر قابل انطباق نہ ہو، وہاں پر حالات کی رعایت کرتے ہوئے شرعی اصولوں سے استنباط کے ذریعہ راستہ نکالا جائے۔ اصل کے اعتبار سے اجتہاد اصولی مسائل میں ہوتا ہے۔ مگر عملی طور پر ہمارے فقہاء کی زیادہ توجہ فروعی مسائل میں اجتہاد تک محدود ہوگئی۔ اس وجہ سے وہ آیات واحادیث سے اس قسم کا اجتہاد کرنے سے غافل رہے، جس کا اثر زیادہ وسیع اور دوررس ہوتا ہے۔

مثلاً قرآن کی ایک آیت ہے: يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ (5:21)۔ یعنی، اے میری قوم، اس پاک زمین میں داخل ہوجاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔ اور اپنی پیٹھ کی طرف نہ لوٹو ورنہ نقصان میں پڑ جاؤ گے۔

کچھ لوگ اس آیت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے ساتھ خاص مانتے ہیں۔ مگر یہ بلاشبہ ایک جذبات پر مبنی اجتہاد ہے۔ کیوں کہ آیت کے الفاظ عام ہیں تو خاص کرنے کی دلیل اس سے نہیں نکلتی۔ قرآن کی اس آیت کے بارے میں موجودہ دور کے علما صحیح اجتہادی اسپرٹ سے محروم ہوگئے ہیں۔ ان میں سے کچھ علما اس حد تک گئے ہیں کہ انھوں نے فلسطین کے معاملے میں خودکش حملے کو جائز قرار دے دیا ہے۔ یہ صرف غلو نہیں ہے، بلکہ وہ حرام کو حلال قرار دینے کے ہم معنی ہے، یہ سنگین غلطی اس لیے ہوئی کہ علما نے اسرائیل کے مسئلے کو ایک مستثنیٰ مسئلہ قرار دے دیا۔

قرآن کی اس مذکورہ آیت کو منسوخ سمجھنا، یا اسے حضرت موسیٰ کے زمانے سے مخصوص قرار دینا، بلاشبہ ایک بے کمزور تفسیر ہے۔ اس لیے کہ قرآن یا حدیث میں اس کی کوئی صحیح دلیل موجود نہیں۔

اجتہاد کی ضرورت

موجودہ دور گلیلیو (1564-1642) اور نیوٹن (1642-1727) سے شروع ہوا ہے۔ یہ ایک نیا دور تھا، جس کو سائنٹفک دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں نیا اجتہاد درکار تھا۔ جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل کی حدیثِ اجتہاد (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 3592) سے رہنمائی ملتی ہے کہ نئے حالات کے مطابق اجتہاد سے کام لینا چاہیے۔ لیکن مسلمان اس نئے دور کو پہچان نہ سکے۔ اس ناواقفیت کی بنا پر وہ تبدیل شدہ حالات میں اجتہاد کا طریقہ اختیار کر کے اپنے عمل کی درست منصوبہ بندی بھی نہ کر سکے۔ برعکس طور پر انہوں نے اس نئے زمانہ اور نئی تبدیلیوں کو دین کے خلاف قرار دے دیا، اور ان کے غلبہ کو ختم کرنے کے لیے پوری شدت کے ساتھ جہاد بالسیف میں مشغول ہو گئے۔

موجودہ زمانے میں اسلام یا مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہی بے خبری ہے۔ اس ناواقفیت کی بنا پر تمام مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ اسلام موجودہ زمانے میں اعداء (enemies) کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ حالانکہ اصل بات یہ تھی کہ یہ دور حدیث کے الفاظ میں تائید اسلام کا دور تھا (مسند احمد، حدیث نمبر 20454)۔ اب ضرورت تھی کہ تائید دین کے اس واقعے کو دریافت کر کے اس کو استعمال کیا جائے، لیکن بے خبری کی وجہ سے دنیا بھر کے مسلمان اس نئے دور کے خلاف نفرت اور تشدد کی راہ پر چل پڑے۔ آج مسلمانوں کا اصل چیلنج یہ ہے کہ وہ اجتہاد کے ذریعے اپنی اس بے خبری کا خاتمہ کریں، نہ کہ مفروضہ دشمنوں کے خلاف نفرت اور تشدد میں اپنی توانائیاں ضائع کریں۔

اسلام کا ایک ہی مشن ہے، اور وہ تمام انسانوں کو خالق کے منصوبۂ تخلیق سے آگاہ کرنا۔ یعنی خدا کا پیغام خدا کے بندوں تک ان کی قابلِ فہم زبان میں پہنچانا۔ قدیم زمانے میں وقتی طور پر اس مشن کا طریقِ کار (method) جہاد بالسیف بن گیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ قدیم زمانہ مذہبی جبر (religious persecution) کا زمانہ تھا، جس کو قرآن میں فتنہ (2:193) کہا گیا ہے۔ قدیم زمانہ جابرانہ نظام کا زمانہ تھا، اور ان لوگوں نے قائم کر رکھا تھا جن کو حدیث میں ملوک الارض (صحیح

البخاری، حدیث نمبر 6519) کہا گیا ہے۔ یہ لوگ اپنے سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کو استعمال کرتے تھے، اور انسانوں کو کسی نئے مذہب کو اپنانے کی آزادی نہیں تھی۔ رسول اور اصحابِ رسول کی کوششوں سے اب ملوک الارض ختم ہو گئے۔ ان کی جگہ جمہوریت (democracy) کا دور آ گیا ہے۔ قدیم زمانے کا جبری نظام اب ختم ہو گیا۔ اقوام متحدہ (UNO) کے قیام کے بعد اب ساری دنیا میں مکمل آزادی کا زمانہ آ گیا ہے۔ اب تعارفِ اسلام کا مشن بدستور جاری رہے گا، لیکن اس کا طریقِ کار مکمل طور پر پرامن ہوگا۔ اب دفاعی جہاد کی بھی ضرورت نہیں، اب دفاعی جہاد بھی عملاً غیر ضروری ہو گیا ہے۔ کیونکہ جب جارحیت کا وجود نہ ہوگا، تو کس کے خلاف جہاد بالسیف ہوگا۔

موجودہ دور مکمل طور پر ایک پرامن دور (peaceful age) ہے۔ وہ تمام مقصد جس کے لیے قدیم زمانے میں لڑائی کی جاتی تھی، بغیر جنگ کے پرامن طریقے سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اب صرف وہی لوگ جنگ کی بات کرتے ہیں، جو زمانے کی اس تبدیلی سے بے خبر ہیں۔ اسلام کا اصل نشانہ یہ ہے کہ لوگوں کو توحید اور آخرت سے باخبر کیا جائے۔ اس مقصد کو پھیلانے کے لیے اب کوئی بھی رکاوٹ حقیقتاً موجود نہیں۔ اب اگر کوئی لڑائی کی بات کرتا ہے تو اس کا معاملہ "آ بیل مجھے مار" کا مصداق ہے۔

اجتہاد عملاً ایک متروک سنت بنی ہوئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے علما نے خود ساختہ طور پر اجتہاد کو ایک مقدس شرعی مسئلہ بنا دیا ہے۔ حالانکہ اجتہاد کا تعلق ایک عملی ضرورت سے ہے۔ مثلاً جب دنیا میں بحری سفر سے ہوائی سفر کا دور شروع ہوا تو یہ اجتہاد کا معاملہ ہے جو کہ حج کے سفر کے لیے اختیار کیا گیا۔ بدقسمتی سے یہی طریقہ دوسرے معاملات میں نہیں اختیار کیا گیا۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے تمام معاملات اسی لیے غیر حل شدہ پڑے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ جس طرح انھوں نے سفرِ حج کے معاملے میں اجتہاد کا طریقہ اختیار کیا اسی طرح دوسرے معاملے میں اجتہاد کا طریقہ اختیار نہیں کر سکے۔

کیوں یہ عمومی بے خبری

کیوں یہ عمومی بے خبری؟ اس کا جواب خود قرآن وحدیث میں پیشگی طور پر دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں قرآن کے تعلق سے آیا ہے: وَخَبَرُ مَاهُوَ كَائِنٌ بَعْدَ كُمْ (مسند احمد، حدیث نمبر 704)۔ یعنی، قرآن میں مستقبل میں پیش آنے والے واقعے کی خبر ہے۔ مثلاً قرآن میں بتایا گیا ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ یعنی، عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور خود ان کے اندر بھی۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہوجائے گا کہ یہ حق ہے۔

یہ آیت واضح طور پر امت کو مستقبل کے اعتبار سے لائن آف ایکشن دے رہی تھی، یعنی خدا کی دریافت بذریعہ آیاتِ کائنات (signs in nature)۔ مگر حیرت بات یہ ہے کہ کسی نے اس کو موضوع بحث بنایا ہی نہیں۔ سارے لوگ فقہی مسائل میں لگے رہے۔ رسول اور اصحابِ رسول کے بعد کے زمانوں میں یہ ہوا کہ لوگ جوق دور جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ انھوں نے ساری توجہ مسائلِ احکام کو سمجھنے میں لگادی۔ پوری امت اسی میں مصروف ہوگئی اور فقہ عملاً سب سے نمایاں حیثیت اختیار کرگئی۔ قرآن کا مطالعہ یونیورسل نقطۂ نظر سے کرنے کے بجائے فقہی مسائل کے اعتبار سے کیا جانے لگا۔ صدیوں تک یہی طریقہ جاری رہا۔

بعد میں چل کر اس میں ایک نئی بات شامل ہوگئی: تقدیسِ اکابر (اسلاف) کا نظریہ۔ یعنی اکابر کو دین کے ہم معنی سمجھ لینا۔ اکابر نے قرآن وسنت کے حوالے سے جو کہہ دیا، وہ حرفِ آخر ہے، اس سے الگ رائے قائم کرنا مطلوب عمل نہیں۔ اگرچہ بعد کے زمانے میں کچھ لوگوں نے اکابر کے نقطۂ نظر سے اوپر اُٹھ کر قرآن کا مطالعہ کرنا چاہا، اور بدلے ہوئے زمانے کے اعتبار سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی تو عموماً یہ خیال کیا گیا کہ یہ اسلاف پر تنقید ہے، اور اسلاف پر تنقید کو دین پر تنقید یا اس میں تبدیلی کے ہم معنی سمجھ لیا گیا۔

حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمادیا تھا: نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي فَوَعَاهَا وَحَفِظَهَا وَبَلَّغَهَا، فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2658)۔ یعنی، اللہ اس

شخص کو تر و تازہ رکھے جو میری بات سنے، اسے یاد رکھے، محفوظ کرے اور دوسروں تک پہنچائے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی صاحبِ فہم ہو، اور وہ میری بات اُس تک پہنچائے جو اس سے زیادہ گہری سمجھ کا حامل ہو۔

زیادہ گہری سمجھ کا حامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین کو زیادہ گہرائی کے ساتھ اور اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق بہتر طور پر سمجھے گا۔ یعنی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فہمِ دین کے معاملے میں جمود ایک نامحمود عمل ہے۔ مسلم تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قدیم زمانے میں انا قائم الزمان، اور جدید دور میں مجدد کامل جیسے الفاظ تو بولے گئے، لیکن ان الفاظ کا مصداق حقیقی طور پر پیش نہ کیا جاسکا۔ اس کی وجہ شخصی تقدس کا وجود میں آنا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے پچھلے عمل کا از سرِ نو جائزہ (reassessment) کریں، اور جو کام رسول اور اصحابِ رسول کے زمانے میں شروع ہوا، مگر درمیانی ادوار میں جا کر رک گیا تھا، اس کو دوبارہ شروع کریں۔ یعنی قرآن کی آیتوں کا دوبارہ یونیورسل یا اجتہادی نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا نظام اجتہاد کے بغیر نہیں چل سکتا، اور اجتہاد اختلاف رائے کے بغیر ممکن نہیں۔ جہاں اختلاف رائے نہ ہو، وہاں جمود ہوگا، اور ذہنی جمود درحقیقت ذہنی موت ہے، جس کے بعد حقیقی ترقی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ تقدیسِ اکابر کا نظریہ انسان کو اختلاف رائے سے روک دیتا ہے۔ حالانکہ یہی اختلافِ رائے اجتہاد کا دروازہ ہے، وہ انسان کے اندر یونیورسل اپروچ پیدا کرتا ہے۔

اختلافِ رائے کا اظہار ہمیشہ تنقید (criticism) کی صورت میں ہوتا ہے۔ مگر تنقید خواہ وہ کسی شخص کے حوالے سے کی گئی ہو، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے مطالعے کی ایک صورت ہوتی ہے۔ تنقید کا اصل مقصد کسی موضوع پر کھلے تبادلۂ خیال (open discussion) کا آغاز کرنا ہوتا ہے۔ تنقید کا مقصد یہ ہے کہ مختلف ذہن (mind) دیانت دارانہ طور پر (with intellectual honesty) اپنے نتیجۂ تحقیق کو بتائیں اور پھر دوسرے لوگ دیانت داری کے ساتھ اُس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اِس طرح کا آزادانہ تبادلۂ خیال اجتہاد کا بنیادی تقاضا ہے۔

آج اب ضرورت ہے کہ قرآن کو اس کی ابدی حقیقت کے اعتبار سے پڑھنے کا طریقہ اختیار کیا جائے، تاکہ ہمیں ان تمام معاملات میں ربانی رہنمائی حاصل ہو سکے جس کی موجودہ دور میں سب سے زیادہ ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔

قساوت کیا ہے

قرآن کی سورۃ الحدید میں اہل ایمان کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ (57:16)۔ یعنی، کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور اس حق کے آگے جو نازل ہو چکا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔

قرآن کی اِس آیت میں کسی اُمت کی اُس حالت کو بیان کیا گیا ہے، جو کہ امت کی کئی نسلیں گزرنے پر بعد کے لوگوں میں لازماً پیدا ہوتی ہے۔ اِس حالت کا دوسرا نام زوال (degeneration) ہے۔ کسی امت پر جب زوال آتا ہے تو لوگوں کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ دل کی اِس سختی (قساوت) کو قرآن میں سورۃ البقرۃ میں پتھر کی حالت سے تعبیر کیا گیا ہے (2:74)۔

قساوت کیا ہے۔ وہ دراصل دینی اعتبار سے افرادِ امت کا بے روح (spritless) ہو جانا ہے۔ بعد کی نسلوں میں جب زوال کی یہ حالت آتی ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ وہ دین سے علاحدگی کا اعلان کر دیں، بلکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی دین داری محض ظاہری فارم (form) تک محدود ہو جاتی ہے۔ جہاں تک داخلی روح کا تعلق ہے، وہ ان کے اندر موجود نہیں ہوتی۔ امت کی بعد کی نسلوں میں زوال کی یہ حالت فطرت کے ایک قانون کے تحت ظہور میں آتی ہے۔ زوال کے اِس واقعے کا پیش آنا کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ اصل برائی یہ ہے کہ جب زوال کی یہ حالت پیش آئے تو اُس وقت اس کی اصلاح کی صحیح تدبیر نہ کی جائے۔ بروقت صحیح تدبیر سے امت دوبارہ اپنی اصل مطلوب حالت پر قائم ہو سکتی ہے، لیکن اگر بروقت صحیح تدبیر نہ کی جائے تو اس کے بعد قساوت کی حالت باقی رہتی ہے۔ جو آخرکار 'فسق' تک پہنچ جاتی ہے، یعنی پوائنٹ آف نو رٹرن (point of no return) تک۔

امانی اور فکری زوال

قرآن میں اہلِ کتاب قوموں کی زوال یافتہ روش کا تفصیل سے ذکر آیا ہے۔ ان میں سے ایک رویہ وہ ہے جس کو انسانی زبان میں خوش خیالی کہا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں (المائدۃ، 5:18)۔ یہودی اور نصرانی پیدا ہونا ہی ہدایت یاب ہونا ہے (البقرۃ، 2:135)۔ ہمارا کوئی آدمی جہنم میں نہ جائے گا۔ اور اگر گیا بھی تو اس کا جانا صرف چند روز کے لیے ہوگا (البقرۃ، 2:80)۔ قرآن نے ان کی ان خوش خیالیوں کو "امانی" (البقرۃ، 2:111) کہا ہے۔ ارشاد ہوا کہ اس قسم کے امانی خواہ یہود قائم کریں یا مسلمان قائم کریں، خدا کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ خدا کا ابدی قانون تو یہ ہے کہ جو شخص جیسا کرے، اس کے مطابق اس کو بدلہ دیا جائے (النساء، 4:123)۔

امانی کے معنی ہیں بے بنیاد توقعات۔ عبداللہ بن عباس، مجاہد اور فراء نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ موضوع روایات اور بے سند قصے ہیں جو یہودی علما و مشائخ نے وضع کیے اور پھر وہ پوری قوم میں رائج ہو گئے۔ قومِ یہود کے انتہائی مبالغہ آمیز فضائل، یہودیت سے تعلق رکھنے والی معمولی معمولی چیزوں کے مقدس اور متبرک ہونے کی طلسماتی داستانیں کثرت سے ان کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ پوری کی پوری قوم حقیقی عمل سے غافل تھی اور انہیں موضوع روایات اور بناوٹی قصے کہانیوں پر جی رہی تھی۔

ٹھیک یہی حال آج مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ کتاب اللہ کے بجائے عملاً "کتاب الامانی" ان کے دین کا ماخذ بنی ہوئی ہے۔ فضائل اعمال کی بے اصل روایات اور بزرگوں کے کشف و کرامت کی فرضی داستانیں بے شمار تعداد میں قوم کے اندر پھیلا دی گئی ہیں اور مسلم عوام کی کثیر تعداد انہیں خوش خیالیوں کے سہارے جی رہی ہے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے درمیان بہت سی اصلاحی تحریکیں اٹھیں، مگر وہ سب کی سب اپنے نشانے کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ اِس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے اِس مفروضے کے ساتھ اپنا کام شروع کیا کہ یہاں ایک "خیرِ امت" موجود ہے اور

اس کو زندہ کرنے کے لیے صرف یہ کرنا ہے کہ اس کے اندر جوش وولولہ پیدا کر دیا جائے۔ اقبال کا یہ شعر اِسی ذہن کی نمائندگی کرتا ہے:

نوارا تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

حُدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

یعنی، اگر جذبہ اور شوق کم پڑ جائے تو اپنی آواز میں شدت پیدا کر، اور جب سفر بوجھ لگنے لگے تو حوصلہ بڑھانے والے ترانے کو بلند آواز میں گا۔

مگر امت کی احیا کا یہ صحیح طریقہ نہیں۔ امت کی احیا کا مطلب یہ ہے کہ امت کے افراد کو صحیح اور مثبت راستے پر ڈالا جائے ان کو "امانی" سے باہر نکالا جائے۔ قانون فطرت کے مطابق اس دنیا میں کوئی بھی تعمیری مشن غوغائی سیاست سے شروع نہیں ہوتا۔ تعمیری مشن ہمیشہ افراد سازی سے شروع ہوتا ہے۔ احیائے امت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اِس بات کو تسلیم کیا جائے کہ موجودہ زمانے کے مسلمان خیر امت کی سطح پر نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک زوال یافتہ امت (degenerated community) ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے یہود ونصاری کون تھے۔ وہ دراصل دورِ قدیم کی زوال یافتہ امت تھے۔ قرآن میں ان کی جو حالت بیان کی گئی ہے، وہ امتِ مسلمہ کے موجودہ دورِ زوال کے لیے ایک آئینہ ہے۔ یعنی امت مسلمہ کو اپنی اصلاح کے لیے وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے، جو قرآن میں اہل کتاب کی اصلاح کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ بعد کے مسلم رہنماؤں کے لیے کرنے کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ امت کے افراد کو خیر امت فرض کر کے کام کا آغاز کریں، بلکہ وہ اصلاح سے پہلے اِس حقیقت کو تسلیم کریں کہ یہ امت زوال کے اُس مرحلے میں پہنچ چکی ہے جہاں یہود ونصاری پہنچے تھے۔ اِس بنا پر اُن کی اصلاح کے لیے عملاً وہی طریقہ کارآمد ہوسکتا ہے جو قرآن میں یہود ونصاریٰ کی اصلاح کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔ اور ان تمام باتوں کا خلاصہ سورۃ الحدید (57:16-17) میں اس طرح بتایا گیا ہے کہ پہلے افرادِ امت کے شعور کو بیدار کرنا اور اس کے بعد اس کی عملی اصلاح کرنا۔

کشمیر کا خواب

ایک مسلم نوجوان اگست 2008 میں کشمیر گئے۔ وہاں وہ تین ہفتہ رہے۔ ان کی عادت ہے کہ وہ روزانہ اپنی ڈائری لکھتے ہیں۔ وہ کشمیر سے واپس آئے تو انھوں نے مجھ کو اپنی ڈائری دکھائی۔ ان کی اِس ڈائری کا ایک اندراج یہ تھا:

"4 اگست 2008 کی ایک رات کو میرا قیام ادارہ "اپنا گھر" میں تھا۔ وہاں ادارے کے ایک طالب علم جاوید احمد (19 سال) بھی موجود تھے۔ صبح کو میں بیدار ہوا تو جاوید احمد نے ماہ نامہ الرسالہ سے متعلق اپنا ایک خواب بیان کیا، جو اُنھیں کے الفاظ میں اِس طرح تھا: "میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص ہے۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی سفید داڑھی ہے۔ وہ اَن پڑھ ہے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے — مجھے الرسالہ کا ممبر بناؤ، مجھے الرسالہ کا ممبر بناؤ۔"

اِس خواب میں مذکورہ بوڑھا آدمی گویا کہ کشمیر کی روح ہے۔ کشمیر کی روح چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ جو منفی افکار میرے درمیان پھیلائے جا رہے ہیں، اُن سے میں بے زار ہوں، ان کو بند کرو۔ میرے درمیان الرسالہ کو پھیلاؤ، میرے درمیان الرسالہ والے مثبت افکار کو عام کرو۔

کشمیر میں اکتوبر 1989 میں متشددانہ جہاد کا آغاز ہوا۔ یہ سلسلہ مختلف صورتوں میں، تادمِ تحریر (مارچ 2012) جاری ہے۔ اِس نام نہاد جہاد کے دوران کشمیر میں جان و مال کا بے حساب نقصان ہوا ہے۔ اِس خود ساختہ جہاد نے اہلِ کشمیر کو تباہی کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔

اب کشمیر کی سلامتی کی صرف ایک صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ کشمیر میں اُن افکار کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے جس کا پیغام ماہ نامہ الرسالہ میں مسلسل طور پر دیا جا رہا ہے۔ اِسی میں اہلِ کشمیر کے لیے زندگی ہے۔ اِس کے سوا جو کچھ ہے، وہ موت اور تباہی کے سوا کچھ اور نہیں۔ نام نہاد کشمیری تحریک سے کچھ لیڈروں کو فائدہ ہو سکتا ہے، لیکن خود کشمیر یا کشمیری عوام کا اس میں کچھ فائدہ نہیں — اب آخری وقت آ گیا ہے کہ اِس معاملے میں نظر ثانی کی جائے اور جذباتیت کو چھوڑ کر حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ (الرسالہ مارچ 2012)

تشدد کی تزئین

تشدد (violence) کامل معنوں میں ایک تخریبی عمل ہے۔ پوری تاریخ بتاتی ہے کہ تشدد کے ذریعے کبھی بھی کسی فرد یا گروہ کو کوئی مثبت کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جب بھی کسی فرد یا گروہ نے تشدد کا طریقہ اختیار کیا تو اس کے حصے میں صرف تباہی آئی، نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی تعمیر۔ اِس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ لوگ بار بار تشدد کا فعل کرتے ہیں، لوگ بار بار متشددانہ کارروائی کرتے ہیں۔ اِس کا سبب شیطانی تزئین (satanic beautification) ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ شیطان کا خاص طریقہ یہ ہے کہ وہ ایک غلط کام کو خوب صورت الفاظ میں پیش کرتا ہے، وہ فساد کو اصلاح کا نام دیتا ہے (15:39)۔ اِس طرح شیطان لوگوں کے ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو اِس فرضی یقین میں مبتلا کرتا ہے کہ جو کچھ تم کرنے جارہے ہو، وہ تشدد نہیں ہے، بلکہ وہ مقدس جہاد ہے۔ وہ شہادت کا راستہ ہے جو تم کو سیدھے جنت تک پہنچانے والا ہے۔ اِس طرح شیطانی تزئین کا شکار ہو کر لوگ تشدد کا عمل کرنے لگتے ہیں۔ وہ ایک غلط کام کررہے ہوتے ہیں، لیکن شیطان اُن کو اس فریب میں مبتلا رکھتا ہے کہ یہ ایک اچھا کام ہے۔

اِس شیطانی تزئین سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، وہ یہ کہ اپنے عمل کو نتیجہ (result) کے اعتبار سے جانچا جائے۔ جو متشددانہ عمل تباہی کے انجام تک پہنچ رہا ہو، جس سے ملے ہوئے مواقع برباد ہوتے ہوں، اُس کے بارے میں یہ یقین کرلیا جائے کہ وہ شیطان کی تزئین کا نتیجہ ہے اور پھر توبہ واستغفار کرکے اُس سے دوری اختیار کرلی جائے (الاعراف، 7:201)۔ حقیقت یہ ہے کہ تشدد اپنے آپ میں ایک نامطلوب فعل ہے۔ تشدد کبھی کوئی اصلاح پیدا نہیں کرتا، وہ صرف مزید نقصان کا سبب بنتا ہے۔ تشدد ایک حیوانی فعل ہے، وہ کوئی انسانی فعل نہیں۔ تشدد ہمیشہ نفرت اور عداوت سے پیدا ہوتا ہے۔ اپنے اندر سے نفرت اور عداوت کی سوچ کو ختم کردیجیے۔ اِس کے بعد کبھی شیطان آپ کے اوپر قابو نہ پاسکے گا۔ تشدد جیسے فعل سے آپ کامل طور پر محفوظ ہوجائیں گے۔

انسان، اعلیٰ انسان

مسٹر منوہر پاریکر گوا کے چیف منسٹر تھے۔ ان کی پیدائش 31 دسمبر 1955 کو گوا میں ہوئی، اور 17 مارچ 2019 کو چیف منسٹر رہتے ہوئے کینسر سے ان کی وفات ہوگئی۔ وہ چار بار گوا کے چیف منسٹر رہے، اور ایک مرتبہ مرکزی وزیر برائے ڈیفنس بھی رہے۔ وہ انڈیا کے ایک مقبول سیاست داں تھے۔ ان کی وفات پر آئی آئی ٹی ممبئی کے ایکٹنگ ڈائریکٹر پروفیسر اے کے سریش نے کہا کہ ان کے جیسا آدمی ملین میں ایک ہوتا ہے:

> On Monday evening, a day after the former chief minister's demise, IIT-Bombay held a condolence event in his honour. The acting director, Professor AK Suresh, described the loss as not only a "void in the political arena, but also one in humanity". "People like him are one in a million, and the values that IIT aims to instill within its students are those that he imbibed within himself, and in doing so he has made IIT proud." said Suresh. (*The Times of India*, New Delhi, Mar 19, 2019, p. 11)

وہ با اخلاق اور امانت دار (honest) آدمی تھے۔ سیاست میں رہتے ہوئے انھوں نے بہت سے اچھے کام کیے۔ ان کے بارے میں بہت سے واقعات بیان کیے جاتے ہیں، جو ان کی ایمانداری اور ذمہ داری کے ثبوت ہیں، اور جس سے ان کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مثلاً ایک مرتبہ ایک ناکابندی پر دیر رات کو پولیس والے نے ایک گاڑی کو روکا، اور پوچھا کہ اتنی رات کو کیا کر رہے ہو۔ یہ کار والے آدمی گوا کے سی ایم مسٹر پاریکر تھے، جو بغیر ریڈ بتی کی گاڑی میں سیکورٹی کے بغیر سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر جا رہے تھے، جس وجہ سے پولیس والا ان کو پہچان نہیں پایا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے، وہ پنجی (Panji) کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں سادہ انداز میں گئے۔ وہاں پر موجود سیکورٹی گارڈ ان کو پہچان نہیں پایا، اور روٹین کے مطابق ان کو عام آدمی کی طرح جانچ کے مراحل سے گزار کر اندر داخل ہونے دیا۔ انھوں نے بغیر کسی پس وپیش کے رول کو فالو کیا۔ بعد

میں جب واچ مین کو حقیقت معلوم ہوئی تو اس کو لگا کہ اب اس کی نوکری چلی جائے گی، مگر مسٹر پاریکر نے اس کی ہمت افزائی کی، اور کہا کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔

ایک مراٹھی نیوز ویب سائٹ PuneriSpeaks نے 17 مارچ 2019 کو ان کو یاد کرتے ہوئے حسبِ ذیل باتیں لکھی ہیں:

”مسٹر منوہر پاریکر ہمیشہ اپنے اسکوٹر پر وزارت اعلیٰ کی آفس جاتے تھے۔ ایک سادہ زندگی گزارنے والے منوہر پاریکر کی یہی پہچان تھی۔ اپنی اسکوٹر پر ہیلمٹ پہن کر وہ پنجی میں چکر لگاتے ہوئے وزارت پہنچا کرتے تھے۔ باقی وزرائے اعلیٰ کی طرح کبھی ان میں دکھاوا نہیں تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ منوہر پاریکر کو سادہ طرزِ زندگی پسند تھا۔ اسی لیے وہ مشہور بھی تھے۔ اچانک کسی عام ہوٹل میں کھانا کھانے چلے جانا، عام لوگوں کی طرح اسکوٹر پر گھومنا ان کے لیے معمول تھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے، منوہر پاریکر ہمیشہ کی طرح صبح صبح اپنی اسکوٹر پر جا رہے تھے۔ راستہ میں ٹریفک کی بھیڑ کم تھی۔ ایک ٹریفک سگنل پر ان کے پیچھے ایک لڑکا انتہائی تیزی سے آڈی کار چلاتا ہوا آیا، اس کو یہ لگا کہ منوہر پاریکر سگنل پر نہیں رکیں گے۔ مگر نظم وضبط کے پابند پاریکر سگنل پر رک گئے۔ اچانک رکی اسکوٹر کی وجہ سے آڈی ڈرائیور گھبرا گیا۔ زور سے بریک لگاتے ہوئے بڑی مشکل سے گاڑی روکی، اور انتہائی غصے کے ساتھ منوہر پاریکر سے بولا: کہاں بیچ راستے میں رک گیا ہے، ایک طرف ہو جا، تجھے معلوم نہیں میں کون ہوں، میرا باپ DSP ہے۔ مگر پُرسکون اور سادہ مزاج منوہر پاریکر نے اپنا ہیلمٹ اتارتے ہوئے اس لڑکے سے کہا: تو پھر اپنے باپ سے جا کر کہنا کہ تجھے وزیر اعلیٰ ملے تھے۔ اور سنو، گاڑی آہستہ چلایا کرو۔ ایسا مشورہ دیتے ہوئے انہوں نے نرمی سے جواب دیا۔ حالانکہ وہ خود وزیر اعلیٰ تھے، وہ اگر چاہتے تو جواب میں شدت کا طریقہ اختیار کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے نرم انداز میں اس لڑکے کو سمجھایا۔“

ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں انسان کو اعلیٰ انسان بناتی ہیں۔ مسٹر پاریکر کی زندگی یہ سبق دیتی ہے کہ آدمی اگر چاہے تو اس کے لیے ہر جگہ اچھا انسان بننے کا موقع موجود ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر کبر کی نفسیات سے بچائے۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

تسبیحِ فاطمہ

ایک مرتبہ امریکا کے سفر میں میں نے ڈاکٹر وقار عالم کی اہلیہ، مزنصرت فاطمہ کو ایک نصیحت کی۔ میں نے کہا کہ آپ کو امریکا میں دوسروں کی طرح تنہائی (loneliness) کا احساس ہوتا ہوگا۔ میں نے کہا کہ آپ اگر تسبیح فاطمہ کی اسپرٹ کو اپنے اندر شامل کرلیں تو آپ کا گھر فرشتوں سے بھرا رہے گا۔ میں نے کہا کہ تسبیح فاطمہ کوئی پراسرار چیز نہیں۔ تسبیح فاطمہ کا مطلب ہے، فرشتوں کو اپنا مددگار بنانا۔

تسبیح فاطمہ کیا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں تاکہ وہ آپ سے گھر کے لیے ایک خادم مانگیں۔ مگر آپ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ کو خادم دینے کے بجائے یہ تسبیح سکھائی۔ آپ نے فرمایا کہ تم 33 بار کہو سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ پھر 33 بار کہو الحمدللہ، الحمدللہ۔ پھر 34 بار کہو اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ تمھارے لیے اس چیز سے بہتر ہے، جو تم نے مانگا ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5361)۔

یہ عام طور پر تسبیح فاطمہ کے نام سے مشہور ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ کو اس کی تلقین فرمائی تھی۔ لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے حضرت فاطمہ کے واسطہ سے امت کی تمام خواتین کو ذکر کا یہ قیمتی تحفہ عطا فرمایا ہے۔ بظاہر وہ تسبیح فاطمہ ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ تسبیح خواتین ہے۔

اصل یہ ہے کہ فطری طور پر عورتوں کا ایک خاص مزاج ہے۔ اس مزاج کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عورتیں جب اکٹھا ہوتی ہیں تو وہ فوراً ایک دوسرے کی باتوں کا غیر ضروری چرچا کرنے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ کسی نہ کسی کے بارے میں لایعنی باتیں ان کا موضوعِ گفتگو بن جاتی ہیں۔ یہ عورتوں کی ایک عام کمزوری ہے جس سے بہت کم عورتیں اپنے کو محفوظ کر پاتی ہیں۔

مذکورہ تسبیح عورتوں کو اس گناہ سے بچانے کی ایک تدبیر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح خواتین کو ایک اچھی مشغولیت دے دی ہے جس میں اپنے آپ کو مصروف کرکے وہ ثواب بھی حاصل کریں اور آخرت کے نقصان سے بھی بچ جائیں۔

خاص طور پر زیادہ عمر کی عورتوں کے لیے وہ اور بھی زیادہ اہم ہے۔ ایک عورت کی عمر جب بڑھتی ہے تو اس کے بعد اس کی عملی مصروفیت اسی نسبت سے کم ہوجاتی ہے۔ اس کے لیے اپنے خالی وقت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ وہ دوسروں کے بے فائدہ تذکرہ میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ بلکہ تسبیح کی صورت میں خدا کا ذکر کرنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ دنیا میں اس کو قلبی سکون حاصل ہوگا اور آخرت میں جنت کا ابدی آرام۔

ذکرِ جاری

صوفیوں کے یہاں خدا کے لیے ذکر جاری کا تصور ہے۔ یعنی دوامی طور پر ذکر کی حالت طاری رکھنا۔ ذکر جاری کا تصور بجائے خود صحیح ہے۔ مگر صوفیا نے اس کو ضربِ جاری کے معنی میں لے لیا ہے، یہ ذکر جاری کی غلط تعبیر ہے۔

ذکرِ جاری لفظی طور پر مطلوب نہیں، بلکہ اس کا معنی مطلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی معرفت آدمی کے ذہن میں اتنا زیادہ سما جائے کہ اس کو ہمیشہ خدا یاد آتا رہے۔ ہر واقعے، ہر لمحے کے حوالے سے اس کے لیے ہمیشہ خداوند ذوالجلال کی یاد تازہ ہوتی رہے۔

اس دنیا میں جو کچھ ہے، وہ سب خدا کا انعام ہے۔ ذرّہ سے لے کر آفتاب تک ہر چیز براہ راست خدا کا یک طرفہ عطیہ ہے۔ جب بھی آپ کوئی چیز دیکھتے ہیں، کسی چیز کا تجربہ کرتے ہیں تو وہ خدا کے انعام کا ایک تجربہ ہوتا ہے۔ انعام کے اس تجربہ میں منعم (giver) کا اعتراف کرتے رہنا، یہی ذکر جاری ہے۔

علمی اسلوب، اکیڈمک اسلوب

علم کی دنیا میں دو مختلف اصطلاحیں (terms) استعمال ہوتی ہیں— علمی اسلوب اور اکیڈمک اسلوب۔ علمی اسلوب اور اکیڈمک اسلوب دونوں ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ دونوں اصطلاحوں کا مفہوم قریب المعنی ہونے کے باوجود بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ علمی اسلوب اہل مدارس کی اصطلاح ہے، جو علمائے اسلام کے درمیان استعمال ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اکیڈمک اسلوب ایک غیر مذہبی اصطلاح ہے، جو سیکولر اہل علم کے درمیان استعمال ہوتی ہے۔ ان دونوں اصطلاحوں کو ایک سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی اس معاملے میں کنفیوزن کا شکار ہو جائے گا۔ علمی حلقوں میں ایسا آدمی مائنس مارکنگ (minus marking) کا مستحق سمجھا جائے گا۔

اکیڈمک اسلوب کی ایک مثال یہ ہے کہ اٹلی کے فلکیاتی عالم گلیلیو گلیلی (1564-1642ء) سے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ زمین مرکز میں ہے، اور سورج اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ مسیحی علم الکلام کے مطابق، یہ ایک مسلمہ حقیقت بن چکا تھا۔ لیکن سیکولر لوگوں نے اس کو نہیں تسلیم کیا، اور گلیلیو کی تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ ساری دنیا کے اہل علم نے اس تحقیق کو قبول کر لیا، آج اس موضوع پر کوئی اختلاف نہیں۔ چنانچہ اس معاملے میں ممکنہ طور پر فری انکوائری کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر ابراہیم نے چار ہزار سال پہلے یہ کہا تھا: فَإِنَّ اللهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ (2:258)۔ یعنی، اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تم اس کو پچھّم سے نکال دو۔ تب وہ منکر حیران رہ گیا۔ حضرت ابراہیم کا یہ بیان کسی انسانی تحقیق پر قائم نہ تھا، بلکہ وہ خدائی اعلان پر قائم تھا۔ یہ بیان ہمیشہ اسی طرح قائم رہے گا۔ اس میں کبھی کوئی تبدیلی آنے والی نہیں۔ یہ علمی اسلوب کی ایک مثال ہے۔

اسلامی موضوعات سب کے سب علمی اسلوب پر قائم ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ کہیں کہ قرآن قطعی

الدلالۃ ہے، تو آپ کے لیے خود قرآن سے اس کے حق میں حوالہ دینا کافی ہوگا۔ اس معاملے میں آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہوگی کہ آپ قرآن کے باہر سے اس کے لیے کوئی علاحدہ دلیل لائیں تب اس کو ثابت شدہ سمجھا جائے۔ مذہبی عقیدے کا پورا نظام اسی اصول پر قائم ہے۔ عقیدے کے معاملے میں اگر کوئی شخص خارجی دلیل دیتا ہے تو وہ اضافۂ علم کے لیے ہوگا، نہ کہ خود علم کے مزید تحقق کے لیے۔

اس حقیقت کو اہل مدارس کی اصطلاح میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ علمی اسلوب کے قواعد بدیہی حقیقت (axiom) کے اصول کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔

Axiom is a self-evident truth that requires no proof. A rule or a statement that is accepted as true without proof.

اکیڈمک اسلوب آزادانہ تحقیق (free inquiry) کے اصول پر قائم ہوتا ہے۔ اس میں ایسا نہیں ہوتا کہ پیشگی طور پر کسی چیز کو بطورِ ابدی حقیقت کے مان لیا جائے۔ حتی کہ کوئی حقیقت اگر ایک بار بظاہر ثابت ہوجائے، تب بھی وہ ری انکوائری (reinquiry) کا موضوع (subject) ہوتا ہے۔ علمی اسلوب میں قطعی الدلالہ کا اصول اپلائی ہوتا ہے، جب کہ اکیڈمک اسلوب میں فری انکوائری کا اصول۔

دس اسلامی اصول

(1) انسانی اخوت (2) مذہبی ٹالرینس (3) صلح اور ایڈجسٹمنٹ (4) پڑوسی کو تکلیف نہ دینا (5) نرمی کا طریقہ (6) تواضع (7) لایعنی کام نہ کرنا (8) بڑے شر سے بچنے کے لیے چھوٹے شر کو گوارا کرنا (9) غصہ اور انتقام نہیں (10) پر امن طریقۂ کار، نہ کہ پرتشدد طریقۂ کار۔

ڈائری 1986

18 جولائی 1986

مکہ میں رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا دشمن ابولہب تھا۔ اس کی بیوی بھی دشمنی میں پوری طرح اس کے ساتھ تھی۔ یہ عورت ابوسفیان کی بہن تھی۔ اس کا نام تھا اروی اور کنیت اُمّ جمیل۔

قرآن کی سورہ لہب میں اس عورت پر سخت تبصرہ ہے۔ جب یہ سورہ اتری اور مکہ میں لوگوں نے اس کو پڑھنا شروع کیا تو ام جمیل نے یہ سمجھا کہ "محمد نے اس کی ہجو کی ہے"۔ وہ غصے میں بھری ہوئی اپنے گھر سے نکلی کہ رسول اللہ ﷺ جہاں ہوں، وہاں پہنچے اور ان کے اوپر پتھر مارے۔

اسی تلاش میں وہ حرم میں پہنچی۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ حضرت ابوبکر نے اس کو دیکھ کر کہا کہ اے خدا کے رسول! یہ اُمّ جمیل آرہی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی کرے گی۔ آپ نے فرمایا کہ آنے دو۔ وہ مجھ کو دیکھ نہیں پائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ آئی مگر وہ حرم میں آپ کو دیکھ نہ سکی۔

اس نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تمہارے صاحب نے میری ہجو (satire) کی ہے۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ اس گھر کے رب کی قسم، انہوں نے تمہاری کوئی ہجو نہیں کی ہے۔ یہ سن کر وہ واپس چلی گئی۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: فَقَالَتْ: يَا أَبَا بَكْرٍ، إِنِّي أُخْبِرْتُ أَنَّ صَاحِبَكَ هَجَانِي. فَقَالَ: لَا وَرَبِّ هَذَا الْبَيْتِ مَا هَجَاكِ (مستدرک الحاکم، حدیث نمبر 3376)۔

یہ ایک قسم کا توریہ (evasive reply) تھا۔ امّ جمیل کو جس بات کی شکایت تھی، وہ قرآن میں اتر رہی تھی، نہ کہ رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے طور پر فرمائی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر حضرت ابوبکر نے کہا کہ انہوں نے تو تمہاری ہجو نہیں کی۔ نازک مواقع پر اس طرح کا کلام عین حکمت اسلامی کا تقاضا ہے۔

19 جولائی 1986

آج جولائی 1986 کی 19 تاریخ ہے۔ اور صبح 4 بجے کا وقت۔ میں ابھی تذکیر القرآن کا آخری صفحہ (تفسیر سورۃ الناس) لکھ کر فارغ ہوا ہوں۔ تذکیر القرآن لکھنے کا کام 1979 کے وسط میں شروع ہوا تھا اور اس کی پہلی قسط ماہنامہ الرسالہ اگست 1979 میں شائع ہوئی تھی۔ آج 19 جولائی 1986 کو اس کی تحریر کا کام آخری طور پر مکمل ہوا۔ اس طرح اس کے لکھنے میں پورے سات سال لگ گئے۔ آج صبح 3 بجے اٹھ کر میں تذکیر القرآن (سورۃ الناس) لکھنے بیٹھ گیا۔ اس کی آخری سطریں عین اس وقت پوری ہوئیں جب کہ نظام الدین کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز آرہی تھی۔

تذکیر القرآن کی تکمیل مجھے ایک خدائی معاملہ نظر آتی ہے۔ یہ میرے لیے اتنا زیادہ مشکل کام تھا کہ اس کا ہر صفحہ لکھنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب میں اس کا اگلا صفحہ نہ لکھ سکوں گا۔

یہی صورت اس کی کتابت کے سلسلہ میں پیش آئی۔ دوسری جلد کی کتابت مجاہد قاسمی صاحب کر رہے تھے۔ وہ چونکہ روزنامہ قومی آواز میں ملازم ہیں، وہ تذکیر القرآن کی کتابت کا کام صرف جزئی طور پر کر پاتے تھے۔ اس لیے اس کی کتابت کا کام بہت سست رفتاری کے ساتھ چل رہا تھا۔ مگر چھ ماہ پہلے اخبار قومی آواز میں ہڑتال ہوگئی اور وہ ابھی تک جاری ہے۔ اس بنا پر مجاہد قاسمی صاحب کے اوقات خالی ہو گئے اور وہ اپنا پورا وقت دے کر تذکیر القرآن کی کتابت کرنے لگے۔ اس مدت میں انہوں نے مسلسل کتابت کر کے تذکیر القرآن کی کتابت مکمل کر دی۔ اب جب کہ تذکیر القرآن کا تحریری کام پورا ہو گیا ہے اس کی کتابت کا کام بھی آخری مرحلے میں ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی اس کی دوسری جلد چھپ جائے گی۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔

1 فروری 1963 کو جب کہ میں اعظم گڑھ میں تھا، میں نے ایک خواب دیکھا۔ اٹھا تو پورا خواب یاد نہیں رہ گیا تھا۔ صرف خواب کا ایک جزء "19 جولائی" ذہن میں باقی تھا۔ بیداری کے بعد مجھے یاد نہ رہا کہ یہ کس بات کی تاریخ ہے۔ صرف اتنا یاد تھا کہ میں نے خواب میں 19 جولائی کی تاریخ دیکھی ہے۔

1963 کے اس خواب کے بعد میں ہر سال 19 جولائی کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ مگر ہر سال یہی ہوا کہ جب 19 جولائی آئی تو اس روز کوئی خاص نمایاں واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس طرح 23 سال بیت گئے۔ 1986 کی 19 جولائی وہ پہلی تاریخ ہے جب کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو شاید میری زندگی کا سب سے زیادہ قابل ذکر واقعہ ہے۔ اور وہ یہ کہ عین اسی تاریخ کو میں نے تذکیر القرآن کا آخری صفحہ لکھا۔

"19 جولائی" کو تذکیر القرآن کا مکمل ہونا بڑا عجیب واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام تمام تر خدا کی مدد سے ہوا اور عین خدا کے منصوبے کے تحت تکمیل کو پہنچا۔

تذکیر القرآن ایسے حالات میں مکمل ہوئی، جب کہ حالات بے حد خراب ہو چکے تھے۔ آج جب میں نے تذکیر القرآن کو مکمل کیا تو میرے دل نے کہا: جو کام مجھے کرنا تھا وہ کام آج پورا ہو گیا۔ یہ میرے لیے اس بات کی حسّی علامت ہے کہ خدا کے دین پر کوئی پردہ نہ ڈال سکے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

21 جولائی 1986

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ سوتے سوتے کوئی بات مجھ پر القاء ہوتی ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ آج پیش آیا۔ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ظہر کی نماز کے بعد لیٹا تو نیند آ گئی۔ 4 بجے اچانک نیند کھلی تو معلوم ہوا کہ خواب کی حالت میں، میں کسی سے بول رہا تھا کہ اسی حالت میں نیند کھل گئی۔

خواب کی یہ گفتگو کس سے ہو رہی تھی، اس کا نام یاد نہیں۔ البتہ یہ یاد ہے کہ میں نے تیز لہجے میں اس سے کہا کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ: "اسلام سائنس کے مطابق ہے"۔ صحیح یہ ہے کہ یوں کہا جائے: "اسلام حقیقت کے مطابق ہے"۔ جو بات بھی حقیقت ثابت ہو وہ یقیناً اسلام کے مطابق ہوگی۔ خواہ وہ سائنس کے ذریعے ثابت ہو یا کسی اور علم کے ذریعے۔ ہر ثابت شدہ چیز اسلام کے مطابق ہے۔ کیوں کہ اسلام خود حقیقت واقعہ ہی کا دوسرا نام ہے۔

تمام حقیقتیں خدا کی پیدا کردہ ہیں۔ اور اسلام بھی خدا کا نازل کیا ہوا ہے۔ گویا دونوں کا مصنف ایک ہے۔ ایسی حالت میں اسلام اور حقیقتِ واقعہ میں غیر مطابقت کا کوئی سوال نہیں۔ اگر کسی

معاملہ میں دونوں کے درمیان غیر مطابقت نظر آئے تو وہ انسان کی اپنی کم علمی کی بنا پر ہوگی، نہ کہ اس لیے کہ اسلام میں اور اس میں کوئی ٹکراؤ ہے۔

30 جولائی 1986

ہندوستان ٹائمس (30 جولائی 1986) صفحہ 16 پر چوکھٹے (باکس) میں ایک خبر ہے، جس کا مختصر عنوان یہ ہے:

Hero or zero?

خبر میں بتایا گیا ہے کہ 29 جولائی کو ہندوستان کی لوک سبھا میں سوال و جواب کا وقفہ تھا۔ ممبران نے انڈسٹریز کے منسٹر آف اسٹیٹ مسٹر کے کے تیواری (Kamla Kant Tiwari, b. 1942) سے کچھ سوالات کیے۔ یہ سوالات ایک foreign digital control system کے بارے میں تھے۔ منسٹر صاحب گھبرائے ہوئے تھے اور جواب نہیں دے پا رہے تھے۔ اسی پر لوک سبھا کے اسپیکر مسٹر بلرام جھاکڑ (پیدائش 1923) نے مسکراتے ہوئے ان کے بارے میں کہا:

Hero of the zero hour.

اپوزیشن بنچ کے لوگ اس کو لے اڑے اور منسٹر صاحب کی خوب ہنسی اڑائی۔ مسٹر جے پال ریڈی (پیدائش 1942) نے کہا:

The minister is not hero but zero.

یہ واقعہ پڑھ کر مجھے قیامت کا منظر یاد آ گیا۔ قیامت میں یہی واقعہ زیادہ بڑے پیمانے پر ہوگا۔ بہت سے لوگ جو دنیا میں بظاہر "منسٹر" بنے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ قیامت میں بالکل بے حقیقت ہو جائیں گے۔ آج کامیابی کی اعلیٰ گدیوں پر بیٹھنے والے لوگ کل کی دنیا میں ناکامی کے آخری مقام پر دکھائی دیں گے۔ آج کے "ہیرو" کل کے "زیرو" ہوں گے۔

کیسا عجیب دن انسان کے اوپر آنے والا ہے۔ اور کیسا عجیب ہے وہ انسان جو اس سے غافل پڑا ہوا ہے۔

ایک انٹرویو

(زیرِنظر انٹرویو کی پہلی قسط الرسالہ جولائی۔اگست، اور دوسری قسط نومبر۔دسمبر 2025 میں شائع ہوچکی ہے)

س: مدارس کے بہت سے طلبہ و اساتذہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے بارے میں غلط تصورات رکھتے ہیں۔اس معاملے سے کس طرح نمٹنا چاہیے؟

ج: اس طرح کی ذہنیت دونوں طرف پائی جاتی ہے۔میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ باہمی تعامل (interaction) کی کمی ہے۔مثبت تعامل منفی ذہنیت کو ختم کردیتی ہے۔اگر کسی ہندو کا کسی مسلمان سے تعلق یا دوستی نہیں ہے، اس نے صرف مسلمانوں کے بارے میں میڈیا کے حوالے سے پڑھا اور جانا ہے، تو مسلمانوں کے بارے میں اس کا تصور نہایت غلط ہوگا۔دوسری صورت میں اگر ایک ہندو مخلوط ہندو مسلم آبادی یا مسلم محلے میں رہتا ہے تو اس کے زیادہ امکانات ہیں کہ مسلمانوں سے متعلق اس کا تصور زیادہ مثبت ہوگا۔مثبت تعامل غلط فہمیوں کے ازالے کا سب سے بہتر ذریعہ ہے اور اس کے لیے کسی مصنوعی پروگرام یا اسکیم کی ضرورت نہیں ہے۔میں تعمیری تعامل کے مثبت نتیجہ کی ایک مثال دیتا ہوں۔ایک گاؤں کے مقامی باشندے وہاں واقع مدرسہ اور اس کے مولوی حضرات کے بارے میں جو وہاں پڑھاتے تھے، نہایت غلط اور مفروضات پر مبنی تصورات رکھتے تھے۔ایک دن بعض ہندوؤں کے گھر میں آگ لگ گئی۔اس کو بجھانے کے لیے مدرسہ کے لڑکے دوڑ پڑے۔اس کے بعد مدرسہ کے تعلق سے وہاں کے ہندوؤں کا رویہ بدل گیا۔مدرسہ اور مدرسہ والوں سے وہ جس قدر نفرت رکھتے تھے اب وہ ان سے اتنی ہی محبت کرنے لگے۔یہ ہے باہمی تعلق اور میل جول کا معجزہ۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مدارس میں دوسرے مذاہب سے متعلق بھی پڑھایا جانا چاہیے؟

ج: جی ہاں! بالکل، اس سے ان کو یہ موقع ملے گا کہ وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ زیادہ بہتر تعلقات قائم کرسکیں۔اس سے ان کی دعوت و اصلاح کی مہم کو بھی تقویت حاصل ہوگی۔دوسرے مذاہب کے بارے میں پڑھانے کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ان مذاہب کے بارے میں ان

کے اندر معروضی شعور پیدا ہو جائے۔ دوسرے مذاہب کی مذمت کا رویہ ترک کیا جانا چاہیے۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے پڑوسی کو سمجھنے کی کوشش کریں، خواہ آپ سے متعلق ہوں یا نہ ہوں۔ جدال غیر احسن اسلامی اخلاق کے مطابق نہیں ہے۔ اس لیے مثال کے طور پر جب میں کسی مندر، گردوارہ یا چرچ وغیرہ میں جاتا ہوں تو میں اپنے ذہن کو تمام تعصّبات سے خالی کر لیتا ہوں۔ اس طرح ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میرا ارادہ دوسروں کو سمجھنے، دوسرے کے متعلق معلومات حاصل کرنا ہوتا ہے، ان کی مذمت کرنا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کو دوسروں تک پہنچانا ہمدردی کی بات ہے، دشمنی کی نہیں۔ یہ فخر کرنے کی بات نہیں ہے کہ ایک مذہب کا ماننے والا دوسرے سے افضل ہے۔ قرآن ہم سے چاہتا ہے کہ ہم دوسروں کے ہمدرد بنیں۔

س: دوسروں کے ساتھ تعامل میں علما کے لیے ایک بڑی رکاوٹ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلم مخالف فضا کی وجہ سے انہیں یہ لگتا ہو کہ انہیں مسترد کر دیا جائے گا۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

ج: اس تعلق سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ تعارفِ اسلام کی راہ میں ہر طرح کی مشقت کو برداشت کرنے اور اپنی ذات کو تج دینے کی ضرورت ہے۔ میں خود اپنی مثال دیتا ہوں۔ جب میں ایک عرصہ قبل دہلی منتقل ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہندوؤں کا ایک گروپ ہفتے میں ایک مرتبہ ایک جگہ ملا کرتا ہے۔ مجھے شدید خواہش ہوئی میں ان کی میٹنگ میں شریک ہوں۔ چنانچہ میں شریک ہونے لگا۔ ایک دن ایک شخص نے ایک مسئلے کے بارے میں مجھ سے پوچھا جو اس کے گمان کے مطابق قرآن سے تعلق رکھتا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ بات قرآن میں موجود نہیں ہے، اس نے اس پر اصرار کیا۔ اس نے کہا کہ وہ اردو جانتا ہے اور اس نے قرآن کا ترجمہ پڑھا ہے۔ اس نے کہا کہ میں اس سے واقف نہیں ہوں۔ میرے لیے یہ بات توہین کے مترادف تھی، نیز قرآن کے تعلق سے اس کے تحقیری رویے سے مجھے شدید دکھ پہنچا۔ لیکن میں نے یہ سب برداشت کیا۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی سختی کا رویہ نہیں اپنایا۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں وہ آگے چل کر میرا دوست بن گیا۔ اسلام سے متعلق گفتگو اور دعوت کے عمل میں اس قسم کے صبر و اعراض کی ضرورت ہے۔

س: مدارس پر لگائے جانے والے دہشت گردی کے الزام سے متعلق آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج: یہ بالکل بے بنیاد الزام ہے۔ کوئی بھی مدرسہ دہشت گردی کی سرگرمیوں میں شامل نہیں ہے۔ پاکستان کے بعض مدارس کے تعلق سے یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ بھی کوئی مدرسے کا ظاہرہ (Phenomenon) نہیں، بلکہ پاکستانی ظاہرہ ہے۔ پاکستان کے پارلیمانی سکریٹری برائے دفاع نے ابھی چند دنوں قبل پاکستانی پارلیمنٹ میں ہندستان کے خلاف جہاد کی بات کہی ہے۔ یہ بالکل پاگل پن کی بات ہے۔ یہ شخص مدرسہ کا فاضل نہیں ہے، یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ پاکستان کے بعض مدارس کا دہشت گردی میں ملوث ہونا ایک پاکستانی معاملہ ہے۔ یہ پاکستان میں سیاسی مفادات کی خاطر اسلام کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا نتیجہ ہے۔ یہ نہایت غلط بات ہے کہ میڈیا کا ایک حلقہ ہندستانی اور پاکستانی مدرسوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور یہ کہ ہندستانی مدرسوں کو بھی پاکستانی مدرسوں کی طرح دہشت گردی میں ملوث سمجھتا ہے۔

س: کیا آپ پاکستان میں اسلام کی اپنی من مانی تشریح کے مذکورہ بالا نکتے پر مزید روشنی ڈالنا چاہیں گے؟

ج: اصل میں پاکستان کی تحریک ہندستانی مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کی تشکیل کے مطالبے اور جدوجہد پر مبنی تھی۔ اس کے لیے اسلام کو ایک آلے اور ذریعہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ آپ اس کا تو مطالبہ کرسکتے ہیں کہ آپ کو الگ سے اپنا ملک چاہیے، لیکن اس کے لیے آپ کو اسلام کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ پاکستان کی تحریک کے علمبردار کہتے تھے کہ اسلام اور پاکستان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اس لیے انہیں اسلام کو مضبوط کرنے اور فروغ دینے کے لیے ایک علاحدہ ملک کی ضرورت ہے۔ یہ بالکل غلط بات تھی۔ اسلام یا کوئی اور مذہب ایک خطۂ ارضی کو حاصل کرکے مستحکم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہ صرف اس طرح مضبوط و مستحکم کیا جاسکتا ہے کہ افراد کے دلوں اور دماغوں میں اس کی جڑیں مضبوط کی جائیں۔ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دل کی جانب اشارہ کرکے فرمایا تھا کہ تقویٰ اور نیکی یہاں رہتی ہے (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2564)۔

استحصال تمام برائیوں کی جڑ ہے اور چونکہ پاکستان کے لیڈروں نے پاکستان کے آغاز سے ہی اسلام کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا، اس لیے یہ بات بالکل فطری تھی کہ ملک اسلام کے نام پر قائم ہونے کے باوجود کشمکش اور مار دھاڑ کا گہوارہ بن جائے۔

س: ایسا کیوں ہے کہ مدارس میں زیادہ تر انتہائی غریب خاندانوں کے بچے ہی تعلیم کے لیے آتے ہیں؟

ج: اس کی وجہ تعلیمی نظام میں پائی جانے والی ثنویت ہے۔ جس کا میں نے اوپر حوالہ دیا۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ اکثر والدین اپنے بچوں کو ماڈرن اسکولوں میں بھیجنا چاہتے ہیں، کیوں کہ مدارس کے فضلا کی تنخواہوں کا معیار نہایت کم ہے۔ مدارس کے اساتذہ کی تنخواہوں کا معیار زیادہ بہتر سے بہتر بنایا جانا چاہیے۔ اگر ایسا ہو تو یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ذہین اور خوشحال خاندانوں کے طلبہ بھی مدارس کا رخ کریں گے۔ ماضی میں مدرسوں سے نہایت ذہین وفہیم اسکالرس اور قائدین نکلے جنہوں نے ہندستان کی سیاسی زندگی میں نہایت اہم رول ادا کیا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہو رہا ہے اور بعض دوسرے اعتبارات سے یہ ان مدارس کے تبدیل شدہ طبقاتی کردار کا بھی نتیجہ ہے۔

س: آپ میڈیا کے بڑے حلقے میں مدارس کی شبیہ کے بگاڑے جانے کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے؟

ج: میڈیا زیادہ سے زیادہ آمدنی پیدا کرنے میں یقین رکھتا ہے۔ وہ مارکیٹ بنانے کے لیے ناظرین کے سامنے ہاٹ نیوز پیش کرنے کی فکر میں یقین رکھتا ہے۔ میڈیا کی سافٹ نیوز میں دلچسپی نہیں ہوتی اس لیے کہ اس سے آمدنی نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ سنسنی خیز اور سلیکٹیو رپورٹنگ کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ ایک دن میں ایک ریڈیو اسٹیشن کی ہندی سروس سن رہا تھا۔ ماریشش کے ایک سامع نے ٹیلی فون پر پوچھا کہ "ماریشش" کو کوریج کیوں نہیں دیا جاتا، جبکہ یہاں ہندی بولنے سمجھنے والے لوگ کافی تعداد میں ہیں۔ پروگرام پیش کرنے والے نے جواب دیا کہ میڈیا صرف گرم خبروں کا شائق ہے، جبکہ ماریشش سے گرم خبریں نہیں ملتیں۔ اس نے پھر مزید کہا کہ کچھ گرم خبریں

پیدا کیجیے، پھر ہم آپ کے ملک کے بارے میں خبریں نشر کریں گے۔ اگر آپ میڈیا کی روش میں تبدیلی چاہتے ہیں تو آپ کو لوگوں کی ذہنیت کو بدلنا ہوگا۔

س: مرکزی مدرسہ بورڈ کی حکومتی تجویز پر آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ج: نظریاتی سطح پر تو یہ صحیح لگتا ہے۔ خاص طور پر اس سیاق میں کہ اس سے مدارس کے نظام کو منظم کرنے میں مدد ملے گی۔ تاہم اصل مشکل حکومت اور مدارس کے درمیان صحت مند تعلقات کی ہے۔ اس بنا پر اس طرح کے بورڈ کا فائدہ بہت زیادہ نہیں ہوگا۔ بہت سے علما حکومت کے ارادے کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ بہرحال اگر یہ بورڈ وجود میں آجاتا ہے تو اس کی پالیسیاں اور سرگرمیاں علما کے مشوروں سے طے کی جانی چاہئیں۔

غیر نزاعی طریقِ کار

اجتماعی زندگی میں کام کرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک ہے نزاعی طریقہ (confrontational approach)، اور دوسرا ہے، غیر نزاعی طریقہ (non-confrontational approach)۔ موجودہ زمانے میں جو سیاسی طریقہ عام طور پر رائج ہوا ہے، وہ زیادہ تر نزاعی طریقہ ہوتا ہے، یعنی برسرِ اقتدار پارٹی سے نزاع کرتے ہوئے اپنا طریقِ کار متعین کرنا۔

اس معاملے میں دوسرا طریقہ تعمیری طریقہ ہے۔ تعمیری طریقہ غیر نزاعی بنیاد پر بنایا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت وہ ہے، جس کو غیر نزاعی طریقہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجود صورتِ حال (status quo) کو بدلنے کی کوشش نہ کرنا، بلکہ کامل طور پر غیر نزاعی انداز اختیار کرکے اپنے منصوبہ کو تکمیل تک پہنچانا۔

دوہرا خسارہ

بیسویں صدی میں جب مغربی طرز کی تعلیم گاہیں قائم ہوئیں تو بعض مسلم مفکرین نے انہیں ایمان کے لیے خطرہ سمجھ کر "قتل گاہ" کا درجہ دے دیا، اور کچھ لوگوں نے جذبات میں آ کر اپنے بچوں کو ان درس گاہوں سے مکمل طور پر دور کر دیا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ادارے اعلیٰ مادی ترقی کے دروازے ہیں، چنانچہ نئی نسل کے مسلم نوجوان تیزی سے ان کی طرف بڑھنے لگے۔ اب لوگوں نے انہی "قتل گاہوں" کو ترقی کا زینہ سمجھا اور بلا اعلان اپنے بچوں کے لیے ان کا دروازہ کھول دیا۔ نتیجتاً نئی نسل کے نوجوان ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ڈگریاں لے کر ملک کے اندر اور باہر بڑی بڑی مادی ترقی حاصل کرنے لگے۔

ابتدائی طور پر یہ ہوا کہ جو مسلم نوجوان مغربی ملکوں میں تعلیم یا ملازمت کے لیے سٹل (settle) ہوئے، انھوں نے اپنے گھر والوں کو مغربی شہروں میں بلایا، تاکہ ان کے والدین بھی جدید ترقیوں کے فائدوں سے محروم نہ رہیں۔ یہ ابتدائی دور کی بات تھی۔ اب دوسری اور تیسری نسل میں خاموشی کے ساتھ یہ رجحان بدل رہا ہے۔ اب نوجوان چاہتے ہیں کہ ان کے والدین اپنی پرانی بستیوں میں رہیں، اور وہ خود کبھی کبھار ان سے مل لیں یا ٹیلیفون پر حال چال پوچھ لیں۔ پہلے بچے اپنے والدین کو اپنے لیے اثاثہ (asset) سمجھتے تھے، اب وہ ان کو بوجھ (liability) سمجھنے لگے ہیں۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں کچھ والدین اپنے نئے ماحول میں سماجی طور پر تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ یہ صورت حال ایسے خاندانوں کے لیے ایک نفسیاتی اور سماجی چیلنج بنتی جا رہی ہے۔

ایسے لوگوں کے لیے دہرا خسارہ ہے۔ پہلے یہ لوگ اپنے وطن سے بے وطن بنے تھے، اور اب وہ اپنے نئے وطن میں اجنبی بنتے جا رہے ہیں۔ اس مسئلے کا حل کیا ہے۔ اس کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ اس مسئلے کا بنیادی پہلو سب کے لیے واضح ہے، اور اس کا حل بھی اصولی طور پر معلوم ہے، مگر اسے اختیار کرنے کے لیے جس عملی قیمت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اکثر افراد یا خاندان ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ ہے ان ممالک میں دینِ اسلام کا مثبت انداز میں تعارف پیش کرنا۔

تشبّہ بالکفار

تشبّہ بالکفار کی ممانعت شریعتِ اسلامیہ کے مسلّم اصولوں میں سے ہے۔ اس کا ثبوت رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4031)۔ یعنی، جس نے کسی قوم کی مشابہت کی، وہ انہی میں سے ہے۔ اس موضوع پر علمائے اسلام نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، مثلاً علامہ ابن تیمیہ کی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفۃ أصحاب الجحیم۔ تشبُّہ بالکفّار کو سمجھنے کے لیے درج ذیل دو اصول بنیادی حیثیت رکھتے ہیں:

وہ امور جو خیر، نفع اور انسانی بھلائی پر مبنی ہوں، ان میں مشابہت ممنوع نہیں ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں سے انصار کے بچوں کو لکھنا سکھانے کا کام لیا تھا: فَجَعَلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِدَاءَهُمْ أَنْ يُعَلِّمُوا أَوْلَادَ الْأَنْصَارِ الْكِتَابَةَ (مسند احمد، حدیث نمبر 2216)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم وفنون جن سے انسانی سماج کی بھلائی وابستہ ہو، انہیں محض اس وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی دوسری قوم میں رائج ہیں۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ آپ نے بیزنطینی حکومت کے ماتحت شام کے عیسائی کے ذریعہ تیار کردہ قمیص، جبّہ شامیہ یا جبّہ رومیّہ کو استعمال فرمایا (صحیح البخاری، حدیث 363؛ مسند احمد، حدیث 18239)۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر اسلامی سماج میں رائج تمدّنی اشیا کو اختیار کرنا تشبّہ کے حکم میں داخل نہیں، جب تک ان میں کوئی مذہبی یا اخلاقی برائی شامل نہ ہو۔

اس کے برعکس، وہ امور جن سے سماج میں شر، فساد یا حدودِ شرع سے تجاوز پایا جائے، ان میں غیر مسلموں کی مشابہت حرام اور مردود ہے۔ ایک مسلمان ایسا کوئی کام دین کے نام پر انجام دے (مثلاً سوسائڈ بامبنگ، وغیرہ)، اور اس کے جواز کے لیے وہ غیر مسلموں کی مثالیں پیش کرے تو یہ غیر شرعی مشابہت کہلائے گی۔ کیوں کہ اللہ تعالی کی نظر میں وہی کام دین کا ہے، جو حدود اللہ کے اندر ہو (النساء، 4:14)۔ کوئی بھی دینی کام اگر شرعی حدود سے باہر ہو یا وہ انسانی جان و مال کے نقصان کا ذریعہ بنے، وہ نہ صرف تشبّہ بالکفار کے زمرے میں آتا ہے، بلکہ حقوق العباد کی پامالی کے تحت ایسا ہر کام اللہ تعالی کی نظر میں سخت مواخذہ کے قابل قرار پائے گا۔ (مولانا فرہاد احمد)

زندگی کی تلخیاں

آپ کسی آدمی سے ملیے۔ تھوڑی دیر کی بات چیت کے بعد آپ پائیں گے کہ اس کے پاس ایک تلخ یاد ہے، اور اس کی بنا پر وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں ایک بدقسمت انسان ہوں۔ بظاہر وہ اپنی باتوں سے یہ تاثر دیتا ہے کہ دوسرے لوگ خوش قسمت ہیں۔ یہ صرف میں ہوں، جو بدقسمتی کے حالات میں جی رہا ہوں۔ مگر یہ ایک بے خبری کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کے لیے زندگی تلخیوں کے تجربات کا نام ہے۔ کسی کے لیے ایک قسم کا تلخ تجربہ، اور کسی کے لیے دوسرے قسم کا تلخ تجربہ۔ اس دنیا میں کوئی بھی شخص تلخ تجربے سے بچا ہوا نہیں۔

مگر ہوتا یہ ہے کہ کوئی عورت یا مرد جس تلخ تجربے سے وہ خود گزر رہا ہو، اس کو وہ ذاتی طور پر محسوس کرتا ہے، جب کہ دوسرے انسان کا تلخ تجربہ اس کے لیے صرف ایک دور کی سنی سنائی خبر ہوتی ہے۔ اپنا تلخ تجربہ اس کے لیے خود اس کے اپنے سینے کا درد ہوتا ہے، جب کہ دوسرے کا تلخ تجربہ اس کے لیے اپنا درد نہیں ہوتا۔ اس بنا پر وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں تو تلخ تجربے کو بھگت رہا ہوں، جب کہ دوسرے لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں۔ یہ فرق صرف سوچ کا فرق ہوتا ہے، نہ کہ حقیقت کا فرق۔ یہ فرق اس لیے ہوتا ہے کہ آدمی ایک حقیقت سے باخبر ہوتا ہے، اور دوسری حقیقت سے وہ بے خبری کا شکار رہتا ہے۔

یہ ظاہرہ اتنا زیادہ عام ہے کہ شاید اس سے کوئی بھی مرد یا عورت بچا ہوا نہیں۔ خوشی دراصل اسی کا نام ہے کہ آدمی اس بے خبری سے باہر آئے۔ وہ غور وفکر کے ذریعے اس حقیقت کو جان لے کہ زندگی کی تلخیاں زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ زندگی ایک تلخ تجربہ ہے۔ تلخی کے احساس سے صرف وہ شخص خالی ہوسکتا ہے، جو موت کا شکار ہو کر عملاً اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ اپنی بے خبری کو توڑیے، اور پھر ایسا نہیں ہوگا کہ آپ اس غلط فہمی کے شکار رہوں کہ آپ ایک بدنصیب انسان ہیں، اور دوسرے تمام لوگ خوش نصیب انسان۔

خبر نامہ اسلامی مرکز — 287

- جناب امجد احمد رائچور (ٹرین منیجر، ساؤتھ انڈیا ریلوے) کی سب سے چھوٹی بیٹی مس نشرہ بتول کی شادی کی تقریب 18 اکتوبر 2025 کو گرین پیلس فنکشن ہال، رائچور میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر سی پی ایس رائچور کی جانب سے ایک قرآنی اسٹال کا اہتمام کیا گیا۔ گلبرگہ سے مولانا فیاض الدین عمری اور حیدرآباد سے مولانا عبدالسلام عمری نے بھی اس میں شرکت کی۔ بہت سے مہمانوں نے قرآن کی تقسیم کے اقدام کو پسند کیا، اور مختلف زبانوں میں قرآن کے تراجم اور انگریزی کتابیں وہ لے کر گئے۔ (ظہیر الدین خواجہ، رائچور)
- شادی کے تعلق سے مسٹر ساجد احمد خان (ناگپور ٹیم) نے ایک نہایت سبق آموز تجربہ شیئر کیا ہے، جو کہ حسب ذیل ہے۔ مسٹر شاہد کا تعلق ناگپور سے ہے، وہ ریلوے میں سروس کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنا واقعہ بتایا کہ ان کی بیٹی کو کرونا (Corona) سے پہلے HSC تک کھیل کود میں دلچسپی تھی، پڑھنے لکھنے میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن کرونا کے بعد اس کو نہ صرف اپنی پڑھائی میں دلچسپی پیدا ہوئی اور اس نے MBA کیا۔ بلکہ اس کو مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا بھی شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نے ایمیزون (Amazon) سے مولانا وحید الدین خان صاحب کا انگلش ترجمۂ قرآن منگوایا اور اسے پڑھا۔ شاہد صاحب کہتے ہیں کہ قرآن پڑھنے کے بعد اس کی زندگی بالکل بدل گئی۔ اُس کو لگا کہ اگر اس نے قرآن کو ترجمہ کے ساتھ نہیں پڑھا ہوتا تو اس کی زندگی ضائع ہو جاتی۔ ترجمۂ قرآن مکمل کرنے کے بعد اس نے مولانا وحید الدین خاں صاحب کی انگریزی تفسیر منگوا کر پڑھی۔ پھر اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح قرآن کا ترجمہ پڑھ کر میری زندگی تبدیل ہوئی ہے، تو یہ اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس ترجمۂ قرآن کو ہر انسان تک پہنچائے۔ اس درمیان اس کی شادی طے ہوگئی۔ چنانچہ شادی کی پلاننگ کے موقع پر اس نے اپنے والد سے کہا کہ شادی کی غیر ضروری رسومات میں خرچ کرنے سے بہتر ہوگا کہ سارے مہمانوں کے لیے ایک ریٹرن گفٹ کے طور پر ہم قرآن تقسیم کریں۔ لہٰذا انہوں نے پلان کیا، اور تمام مہمانوں کے درمیان 350 سے زیادہ تراجم قرآن کے نسخے تقسیم کیے گئے۔ تمام مہمانوں نے شکریہ اور خوشی کے ساتھ قرآن کا ترجمہ لیا۔ ہندی، مراٹھی اور انگریزی تراجم قرآن لینے والوں کا یہ تاثر تھا کہ ”ہم اس کو تلاش کر رہے تھے اور ہم اس کو ضرور پڑھیں گے۔“
- بین الاقوامی طلبہ کی آمد: 18 نومبر 2025 کو CPS انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی میں ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد کے بین الاقوامی طلبہ کا ایک گروپ آیا۔ ان کے ساتھ انٹرایکٹو نشست ہوئی، جس میں طلبہ نے اسلام، مولانا

وحیدالدین خان کی تعلیمات، اور CPS کے وژن اور سینٹر کی سرگرمیوں کے بارے میں بامعنی تبادلہ خیال کیا۔ پروگرام کے اختتام پر تمام طلبا کو انگریزی ترجمۂ قرآن اور دوسرے تعارفِ اسلام پر مبنی لٹریچر دیے گئے۔

- قومی یوتھ کنونشن: ہریجن سیوک سنگھ ایک این جی او ہے، جس کی بنیاد مہاتما گاندھی نے 1932 میں رکھی تھی۔ 20 نومبر 2025 کو اس نے وزارت ثقافت، حکومت ہند کے تعاون سے نیشنل یوتھ کنونشن کا انعقاد کیا۔ یہ کنونشن اڑیسہ کے پہلے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر ہری کرشنا مہتاب (1899-1987) کی 125 ویں یوم پیدائش کی مناسبت سے منعقد کیا گیا، جو مجاہد آزادی اور گاندھی وادی رہنما تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر رجت ملہوترا نے CPS انٹرنیشنل، کی نمائندگی کی اور اسلام میں بین المذاہب مکالمے کے اہمیت پر خطاب کیا۔
- یوتھ سیشن، امریکا: 12 دسمبر 2025 کو سی پی ایس یو ایس اے نے میساچوسٹس میں وے لینڈ کمیونٹی کے یوتھ گروپ کے ساتھ ایک سیشن منعقد کیا، جس کا موضوع تھا: اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں۔ اس پروگرام کے ذریعے واضح کیا گیا کہ غلط فہمیاں کس طرح آسانی سے ایک ذریعے سے دوسرے ذریعے تک منتقل ہوتی ہیں اور کیسے اس کو دور کیا جاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ رہنمائی بھی کی گئی کہ آپس میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں خود احتسابی اور غور وفکر کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کو صرف دوستانہ ماحول اور باہمی گفت وشنید کے ذریعہ ہی دور کیا جاسکتا ہے، نہ کہ نزاعی ماحول پیدا کرنے سے۔ آخر میں تمام شرکا کو مولانا وحیدالدین خاں صاحب کی انگریزی کتاب، قرآنک وزڈم بطور تحفہ پیش کی گئی۔
- Assalamu Alaikum, I'm Iram. I wanted to send this email to express my heartfelt gratitude to the CPS International for responding so quickly to my query and, from then on, for putting a smile on my face and bringing more clarity to my life through my journey of understanding the true essence of Islam. Sometimes, as a 26-year-old, life can get confused. After my sessions with Ms. Fathima Sarah (Bengaluru), I have genuinely fallen in love with Islam all over again because of its intricacies and how beautifully Allah has created everything to make perfect sense. My love for my Creator and His mercy has grown tremendously, and I pray it only continues to grow, Insha'Allah. I am deeply grateful to Ms. Fathima Sarah and the organization for helping me understand Allah's creation plan, why we exist, and how much love Allah truly has for us. In a world full of noise and chaos, I'm truly thankful that Allah guided me to discover the true meaning of Islam, hope, and peace. (iram******@gmail.com, on 30 Oct 2025)

शहर के पादरियों ने दरवाज़ा खोल दिया और उमर के हाथ पर सुलह कर ली।

सुलहनामे की औपचारिकता के बाद हज़रत उमर ने एक संक्षिप्त भाषण दिया। उन्होंने कहा, "ऐ फिलिस्तीन वालो, जो हमारे लिए है वह तुम्हारे लिए है और जो हमारे लिए नहीं वह तुम्हारे लिए भी नहीं।" उमर फ़ारूक का यह सफ़र तमाम दुनिया के शासकों के लिए बेशक एक सर्वश्रेष्ठ आदर्श प्रस्तुत करता है।

आख़िरत का ज़िक्र आते ही अपना दावा छोड़ दिया

उम्मे सलमा (रज़ि०) कहती हैं कि – मदीना के दो मुसलमान एक पुरानी विरासत का झगड़ा लेकर अल्लाह के रसूल (सल्ल०) के पास आए। उस मामले में दोनों के पास न तो कोई गवाह था और न सबूत। रसूलुल्लाह (सल्ल.) ने फ़रमाया – "तुम लोग अपना झगड़ा मेरे पास लाते हो और मैं भी एक इंसान हूँ, हो सकता है तुममें से कोई अपनी बात ज़्यादा अच्छे ढंग से रखे और मैं उसी हिसाब से फ़ैसला कर दूँ। लेकिन अगर मैंने किसी के हक़ में ऐसा फ़ैसला कर दिया जिसमें मैंने उसके भाई का हिस्सा काटकर उसे दे दिया हो, तो वह उसे न ले। क्योंकि असल में मैंने उसे आग का टुकड़ा दिया है जिसे वह क़ियामत के दिन अपनी गर्दन में लटकाए हुए आएगा।"

यह सुनकर दोनों मुस्लमान रो पड़े। दोनों ने कहा – "ऐ अल्लाह के रसूल! मैं अपना हक़ अपने भाई को देता हूँ।" रसूलुल्लाह (सल्ल०) ने फ़रमाया – "जब तुमने ऐसा कर दिया है तो अब जाओ, विरासत को दो हिस्सों में बाँटो। फिर पर्ची डालकर तय करो और जो हिस्सा तुम दोनों में से किसी को मिले, दूसरा उसको उसके लिए हलाल कर दे।" (मुस्नद अहमद, हदीस संख्या 26717)

अब्दुल्लाह अत्तल ने इस पुरालेख का अरबी अनुवाद अपनी किताब में शामिल किया है। इसका विवरण इस प्रकार है:

जब बैतुल मक्दिस पर मुस्लिम फौजों का घेरा बढ़ा तो 636 ई० में वहां का बड़ा पादरी सफ़रे देनूस शहर की दीवार पर चढ़ा, उसने मुस्लिम फ़ौज को सम्बोधित करते हुए कहा कि हम तुमसे सुलह करना चाहते हैं, लेकिन शर्त यह है कि सुलह तुम्हारे 'अमीर' के हाथ पर होगी। इस विषय का एक पत्र मदीना भेजा गया, ताकि अमीरुल मोमिनीन फ़िलिस्तीन आएं और फिलिस्तीन वालों से सुलह का मामला तय करें।

उमर फ़ारूक़ मदीने से बेतुल मक्दिस जाने के लिए निकले, हाल यह था कि उनके साथ सिर्फ एक सवारी और एक गुलाम था। जब वह शहर से बाहर आए तो उन्होंने अपने गुलाम से कहा, "हम दो हैं और सवारी एक है। अगर मैं सवारी पर बैठूं और तुम पैदल चलो तो मैं तुम्हारे ऊपर जुल्म करूंगा और अगर तुम सवारी पर बैठो और मैं पैदल चलूं तो तुम मेरे ऊपर ज़ुल्म करेगे और अगर हम दोनों सवारी पर बैठें तो हम उसकी पीठ तोड़ डालेंगे। इसलिए हम लोग तीन बारी तय कर लें। इस तरह उन्होंने रास्ता इस तरह तय किया कि एक बार उमर सवारी पर बैठते और गुलाम पैदल चलता। इसके बाद गुलाम सवारी पर चलता और उमर पैदल चलते और फिर दोनों पैदल चलते और सवारी खाली रहती। इसी तरह वे सफ़र करते रहे और यहां तक कि वह बैतुल मदिस के पास पहुंच गए।

इत्तफ़ाक़ से उस समय गुलाम की बारी थी। गुलाम ने सवारी पर बैठकर चलने से इंकार किया और चाहा कि आख़िरी चरण में शहर में दाख़िला इस हाल में हो कि सवारी पर उमर फ़ारूक़ बैठे हों। पर उमर फ़ारूक़ इस बात पर राज़ी न हुए और वह बैतुल मक्दिस के दरवाज़े पर इस हाल में पहुंचे कि गुलाम सवारी पर था और उमर फ़ारूक़ पैदल चल रहे थे। उमर फ़ारूक़ को इस हाल में देखकर

का तकिया सिर के नीचे रख कर ज़मीन पर सो जाते थे। मामूली खाना खाते और मामूली घर में रहते।

एक बार अहनफ़ बिन क़ैस उनसे मिलने के लिए मदीना आए तो देखा कि वह मामूली हालत में इधर से उधर दौड़ रहे हैं। अहनफ़ ने पूछा कि क्या बात है? हज़रत उमर ने जवाब दिया कि बैतुलमाल (ख़जाने) का एक ऊंट भाग गया है, उसको ढूंढ रहा हूं, उन्होंने कहा, "आप अमीरुल-मोमिनीन हैं। आप ख़ुद क्यों यह कष्ट कर रहे हैं। आप किसी गुलाम को हुक्म दे देते वह इस काम को कर डालता।" हज़रत उमर ने जवाब दिया: "कौन है जो मुझसे बढ़कर गुलाम है।"

सल्तनत का हाकिम होने के बावजूद अपने आपको आम आदमियों जैसा समझना एक बहुत बड़ी शासकीय नैतिकता है। पर इस शासकीय नैतिकता की व्यावहारिक मिसाल इस्लामी इतिहास के सिवा कहीं और नहीं मिलेगी।

हज़रत उमर फ़ारूक़ की ख़िलाफ़त का दौर 634 से 644 ई. तक है। उन्हीं के ज़माने में फ़िलिस्तीन पर विजय हासिल हुई। इस विजय के मौक़े पर फिलिस्तीन के ईसाई अधिकारियों के आमंत्रण पर हज़रत उमर ने मदीने से फ़िलिस्तीन की यात्रा की। यह सफ़र एक महान साम्राज्य के महान सम्राट का सफ़र था। पर वह इतना सादा था कि इससे ज़्यादा सादगी की कल्पना नहीं की जा सकती।

अब्दुल्लाह अत्तल ने, जो फ़िलिस्तीन के युद्ध (1948) में शामिल थे, एक किताब लिखी है। उसका नाम है : 'खतरुल यहूदिया अल आलमिया अलल इस्लाम वल-मसीहिया' (इस्लामी दुनिया और ईसाइयत को यहूदियत से ख़तरा)।

यह किताब दारूल क़लम (क़ाहिरा) से 1964 में प्रकाशित हुई है। अब्दुल्लाह अत्तल को फ़िलिस्तीन के एक चर्च में एक ऐतिहासिक पुरालेख यूनानी भाषा में लिखा हुआ मिला। यह पुरालेख प्राचीन काल में किसी ईसाई ने लिखा था। इसमें हज़रत उमर के फिलिस्तीन में प्रवेश का उल्लेख है।

लिया, इससे ज़्यादा मुझे कुछ और नहीं चाहिए"। हज़रत उमर ने कहा, "ख़ुदा की क़सम, अगर तुम इनको भी मारते तो हम तुम्हारे और इनके बीच रुकावट न बनते, बशर्ते कि तुम ख़ुद ही इनको छोड़ दो।"

फिर उन्होंने अम्र बिन आस से कहा, "ऐ अम्र, तुमने कब से लोगों को गुलाम बना लिया, हालांकि उनकी मांओं ने उनको आज़ाद पैदा किया था।" (फ़ुतूह मिस्र वल-मग़रिब, इब्न अब्दुल हुक्म, पृष्ठ 195)

यह घटना आदमी के सम्मान और इंसानी बराबरी की सर्वश्रेष्ठ और अंतिम मिसाल है। इस घटना ने एक इंसान और दूसरे इंसान के बीच के हर तरह के भेद को व्यवहारतः ख़त्म कर दिया। इसने इंसानी न्याय और इंसाफ़ की ऐसी मिसाल क़ायम कर दी, जिसके आगे इंसानी अद्लो-इंसाफ का कोई और दर्जा नहीं।

सादा ज़िन्दगी

इस्लामी ख़लीफाओं के ज़माने में धन और सत्ता, दोनों में बेपनाह वृद्धि हुई थी। इसके बावजूद ख़लीफ़ा बिल्कुल सादा ज़िन्दगी गुज़ारते थे। सभी इतिहासकारों ने इसे माना है। मांटगोमरी वॉट (Montgomery Watt) ने लिखा है कि मुस्लिम ख़लीफ़ा जो एक विशाल साम्राज्य के शासक थे, वे अब भी मदीने में सादा तरीक़े से रहते थे:

> The ruler of what was now a vast empire still lived a very simple life in Medina, and had not so much as a bodyguard. *The Majesty That Was Islam*, (1984)

दूसरे ख़लीफ़ा हज़रत उमर फ़ारूक़ (रज़ि०) एशिया और अफ्रीक़ा के बड़े भूभाग के शासक थे, पर उनके जिस्म पर मामूली कपड़ा होता था, जिसमें अक्सर पैबन्द लगा होता था। पानी की मश्क कंधे पर रखकर चलते थे। पत्थर

मानवता का सम्मान

इस्लाम के दूसरे खलीफ़ा उमर फ़ारूक़ (रजि०) के ज़माने में अम्र बिन आस मिस्र के गवर्नर थे। उन्होंने एक बार घोड़ों की दौड़ कराई। इस दौड़ में गवर्नर के बेटे का घोड़ा भी शामिल था, पर जब दौड़ हुई तो एक मिस्री (ग़ैर-मुस्लिम) का घोड़ा आगे बढ़ गया। मिस्री ने विजय के जोश में कोई ऐसा वाक्य कहा जो गवर्नर के बेटे (मोहम्मद बिन अम्र बिन आस) को बुरा मालूम हुआ और उसने उस मिस्री को कोड़े से मार दिया। कोड़ा मारते हुए उसने कहा, "यह लो, और मैं शरीफ़ों की औलाद हूं।

हज़रत अनस बिन मालिक इस घटना को बयान करते हुए कहते हैं कि मिस्री (ग़ैर-मुस्लिम) मिस्र से चलकर मदीना पहुंचा और ख़लीफ़ा उमर फ़ारूक़ से शिकायत की कि गवर्नर के लड़के ने इस तरह उसको कोड़े से मारा। हज़रत उमर ने कहा, "तुम यहां ठहरो" और तुरन्त अपने एक ख़ास आदमी को मिस्र भेजा कि अम्र बिन आस और उनके बेटे मोहम्मद बिन अम्र जिस हाल में हों उनको लेकर मदीना आओ। लिहाज़ा वे लोग लाए गए। जब वे मदीना पहुंचे तो हज़रत उमर ने कहा, "मिस्री कहां है? ये कोड़ा लो और इस शरीफ़ ज़ादे को मारो।"

इसके बाद मिस्री ने कोड़ा लिया और मिस्र के गवर्नर के सामने उसके बेटे को मारना शुरू किया। वह मारता रहा, यहां तक कि उसको ज़ख़्मी कर दिया। हज़रत उमर बीच-बीच में कहते जाते थे कि "शरीफ़ ज़ादे को मारो" जब वह मार चुका तो हज़रत उमर फ़ारूक़ ने कहा, "इनके पिता अम्र बिन आस के सिर पर भी मारो, क्योंकि ख़ुदा की क़सम इनके बेटे ने सिर्फ़ अपने बाप की बड़ाई के ज़ोर पर तुमको मारा था।"

मिस्री ने कहा, "ऐ अमीरुल मोमिनीन, जिसने मुझे मारा था, उसको मैंने मार

कि —जिसको आप अपना दुशमन समझ रहे थे वह आपके लिए ऐसा हो गया है जैसे कि वह आपका क़रीबी दोस्त हो। (क़ुरान, 41:34)

हर आदमी ख़ुदा का बनाया हुआ है। इस दुनिया में कोई आदमी नहीं जिसको ख़ुदा के अलावा किसी और ने पैदा किया हो। इसका मतलब यह है कि हर आदमी के अन्दर वही फ़ितरत है जो किसी दूसरे के अन्दर है। हर आदमी के अन्दर अच्छे और बुरे की वही तमीज़ मौजूद है जो किसी दूसरे के अन्दर पाई जाती है।

इसके साथ ही हर इंसान के अंदर एक अहंकार भी छिपा होता है। यही अहंकार सारी परेशानियों की जड़ बनता है। लेकिन अल्लाह की एक खास रहमत यह है कि उसने हर इंसान के अहंकार को शुरुआत से ही दिल के अंदर सुला कर रखा है—वह जागा हुआ नहीं होता। समझदारी इसी में है कि हम उस अहंकार को सोया रहने दें, उसे कभी जगने न दें।

जब इंसान का अहंकार सोया रहता है, तब वह अपनी असली, सीधी-सादी और नेचुरल हालत में होता है। उस समय वह वही करता है जो असली इंसानियत की मांग है। इंसान तभी बुरा बनता है जब उसका अहंकार जगा दिया जाए।

इंसान की समझदारी इसी में है कि वह किसी दूसरे के अहं को जगाने से पूरी तरह बचे। और अगर कभी किसी का अहंकार भड़क भी जाए, तो समझदारी से तुरंत उस आग को ठंडा कर दे। जो लोग अक्लमन्दी के इस तरीके को इख़्तियार कर लें, उनको कभी दूसरों की तरफ़ से शिकायत न होगी, चाहे वे एक मुल्क में रहते हों या दूसरे मुल्क में।

कोई बड़ा काम सिर्फ़ वह शख़्स करता है जो अपने आपको छोटा काम करने पर राज़ी कर ले

स्टेशन पर जब दोनों उतरे तो नौजवान ने आग्रह करके मौलाना को नाश्ता कराया।

मौलाना इकरामुद्दीन साहब ने इस तरह की कई घटनाएं सुनाईं और कहा कि हिन्दुओं में हमने जो अख़्लाक़ और शिष्टाचार पाया वह अख़्लाक़ हमने मौजूदा मुसलमानों में नहीं पाया।

इसी तरह उन्होंने बताया कि 1982 में मैं 'तरावीह' सुनाने के लिए बंगलौर गया हुआ था। एक दिन मैं बंगलौर से कोरमहल्ली स्कूटर से जा रहा था। रास्ते में मेरे स्कूटर का पैट्रोल ख़त्म हो गया। कुछ दूर तक मैं स्कूटर को धकेल कर ले गया। फिर सड़क के किनारे नारियाल का एक बाग़ दिखाई दिया। उसके अन्दर एक कार खड़ी हुई थी। मैं बाग़ के अन्दर गया। वहां एक हिन्दू बैठा हुआ था। मुझको देखते ही उसने अपने आदमी से कहा कि एक कुर्सी ले आओ। मुझको कुर्सी पर बिठा कर पूछा कि हज़रत क्या काम है? मैंने कहा कि मेरी गाड़ी में पैट्रोल ख़त्म हो गया है। यहां से आठ किलो मीटर दूर जाने पर मुझे पैट्रोल मिल सकेगा। मैं कार देख कर यहां आ गया कि शायद यहां से मुझे पैट्रोल मिल जाए।

उस हिन्दू ने फ़ौरन अपने ड्राइवर से कहा कि देखो अगर बाहर पैट्रोल हो तो इन साहब की गाड़ी में डाल दो। और अगर बाहर न हो तो अपनी गाड़ी में से निकाल कर इनको पैट्रोल दे दो। पैट्रोल लेने के बाद मैंने अपनी जेब से बीस रुपए का नोट निकाला, ताकि पैट्रोल की क़ीमत अदा कर दूं। अब हिन्दू फौरन हाथ जोड़ कर खड़ा हो गया। उसने कहा कि हमको माफ़ कीजिए। पैसे की ज़रूरत नहीं। हमको बस आपकी दुआ चाहिए।

इन्सान को गुस्सा न दिलायिए, और अगर किसी वजह से वह गुस्सा हो जाए तो जवाबी गुस्सा न करके उसे ठंडा कर दीजिए। इसके बाद आप देखेंगे

हिन्दू नौजवान उनके खिलाफ़ बरसता रहा और वह ख़ामोशी से उसको सुनते रहे। यह सब देख कर डब्बे के तमाम हिन्दू उस नौजवान के ख़िलाफ़ हो गए। और मौलाना इकरामुद्दीन साहब की हिमायत करने लगे। उन्होंने नौजवान से कहा कि मौलाना अब चुप हैं और अपनी ग़लती मान रहे हैं तो तुम क्यों उनके ख़िलाफ़ इतना ज़्यादा चीख रहे हो? उन्होंने मौलाना इकरामुद्दीन साहब से कहा कि आप घबराएं नहीं, यह आपका कुछ नहीं बिगाड़ सकता।

आख़िरकार हिन्दू नौजवान चुप हो गया। मौलाना इकरामुद्दीन साहब अपनी जगह पर बराबर खड़े रहे। कुछ देर के बाद नौजवान ने बेरुखी के साथ मौलाना इकरामुद्दीन साहब से पूछा, "आप कहां से आ रहे है?" उन्होंने बताया कि खड़क बाज़ार से। नौजवान ने कहा कि खड़क बाज़ार में एक मौलाना इकरामुद्दीन हैं। क्या आप उनको जानते हैं। वह बहुत अच्छे आदमी हैं। मेरी मां उनके पास गई थी और उनसे तावीज़ लाई थी। उस तावीज़ से बहुत फ़ायदा हुआ। मैं उनसे मिलना चाहता हूं।

मौलाना इकरामुद्दीन साहब ने मुस्कराते हुए कहा कि अभी तो वह सफ़र में है। कल तक वह वहां पहुंच जाएंगे, उस वक़्त उनसे मुलाकात हो सकती है। हिन्दू नौजवान ने पूछा कि आपको कैसे मालूम कि वह सफ़र में हैं। उन्होंने जवाब दिया कि जिस मुसाफिर से तुम बात कर रहे हो वही मौलाना इकरामुद्दीन है।

यह सुनते ही हिन्दू नौजवान ने मौलाना इकरामुद्दीन के पांव पकड़ लिए। उसने कहा कि मुझे क्षमा कर दीजिए। मुझसे बहुत भारी ग़लती हो गई। इस ग़लती पर जी चाहता है कि मैं अपने आपको मारुं। वह नौजवान अपनी सीट से उठ कर खड़ा हो गया। और आग्रह करके मौलाना को अपनी जगह बिठा दिया। इसके बाद वह आख़िरी स्टेशन तक बराबर खड़ा रहा। अगले

इस में सबक़ है

मौलाना इकरामुद्दीन क़ासमी (पैदाइश 1938) डुमरावां (जिला भागलपुर) के रहने वाले हैं। 7 फ़रवरी 1990 की मुलाक़ात में उन्होंने अपने कुछ अबुभव बताए, जिनमें बहुत बड़ा सबक़ है।

1966 की बात है। मौलाना इकरामुद्दीन साहब ने गंगा को स्टीमर से पार किया। वह बरारी रेल्वे स्टेशन पर भागलपुर जाने वाली पैसेंजर ट्रैन पर सवार हो गए। ट्रैन में भीड़ थी। एक जगह सीट पर डालडा का डिब्बा रखा हुआ था। वह डिब्बे को खिसका कर वहां बैठ गए।

थोड़ी देर के बाद एक हिन्दू नौजवान आया। यह डिब्बा उसी का था। वह उसको सीट पर रख कर बाहर चला गया था। जब उसने देखा कि डिब्बा अपनी जगह से हट गया है तो उसने पूछा कि उसको किसने हटाया है? मौलाना इकरामुद्दीन साहब ने कहा कि मैंने हटाया है। यह सुनते ही वह सख़्त गुस्सा हो गया। क्योंकि उसकी आस्था के मुताबिक एक मुसलमान ने उसको छू कर अपवित्र कर दिया था। उसने कहा कि इस डिब्बे में गंगा जल था। इसको लेकर मैं देवघर जा रहा था। इसको तुमने अपवित्र कर दिया। अब वह ले जाने के क़ाबिल नहीं रहा।

वह गुस्से में आपे से बाहर था और बहुत गर्म लेहजे में बार-बार कह रहा था कि तुमने मेरे गंगाजल को अपवित्र कर दिया। मौलाना इकरामुद्दीन साहब ने इन बातों का कोई असर नहीं लिया। वह ख़ामोशी से उठ कर खड़े हो गए और सीट नौजवान के लिए ख़ाली कर दी। उन्होंने कहा कि मैं नहीं जानता था कि इस डिब्बे में गंगाजल है और वह मेरे छूने से अपवित्र हो जाएगा। मुझसे ग़लती हो गई; माफ़ कर दो।

> She belives that women reacted to war in a completely different way from men. The men were more matter-of-fact and casual about the experience, whereas the women reacted in an overwhelmingly emotional manner.

मौजूदा ज़माने में औरतों की प्रकृति और उनकी पैदाइशी योग्यता के बारे में बहुत सी तहक़ीक़ात की गई हैं। औरत की सिन्फ़ (लिंग) को शुद्ध साइन्टिफिक लिहाज़ से समझने की कोशिश की गई है। इन शोध के ज़रिए जो बातें मालूम हुई हैं वे हैरतअंगेज़ तौर पर औरत के बारे में इस्लाम के नज़रिए की पुष्टि करती हैं।

नई खोजों ने बताया है कि औरत पैदायशी तौर पर अति संवेदनशील है। वह मर्द के मुक़ाबले में जज़्बाती और भावुक (emotional) होती है। यह खोज साफ़ तौर पर बताती है कि औरत को ज़िन्दगी के ऐसे क्षेत्रों में दाखिल करना दुरुस्त नहीं जहां ठंडे ज़ेहन के तहत फ़ैसला करने की ज़रूरत हो, जहाँ परिस्थितियों से प्रभावित हुए बिना राय बनानी पड़ती है, और जहाँ जज़्बात के बजाय यथारवादी फैसले की ज़रूरत होती है।

औरत और मर्द में पैदा होने के वक़्त से से ही कुछ फ़र्क़ होते हैं। इसी वजह से इस्लाम में दोनों के काम और जिम्मेदारियाँ अलग-अलग रखी गई हैं। यह कोई दर्जे या बराबरी का मसला नहीं, बस काम के बँटवारे की बात है। असल में तो यह फर्क वही है जो साइंस भी बताती है। सच तो यह है कि इस मामले में कुछ लोग जो "महिला आज़ादी" का नारा लगाते हैं, उनका तरीक़ा ही साइंस के ख़िलाफ़ है—इस्लाम के नहीं।

औरत जंग में

रूसी भाषा में एक किताब औरतों के बारे में छपी है, जिसका अंग्रेजी अनुवाद मास्को से छपा है। किताब की तफ़सील यह है:

> S. Alexiyerich, *War's Unwomanly Face*,
> Progress Publishers, Moscow

दूसरा विश्व युद्ध (1941) छिड़ा तो रूसी हुकूमत ने अपने शहरियों से जज़्बाती अपीलें कीं और मातृभूमि (Mother Land) को बचाओ का नारा दिया। इसके असर से जो रूसी नौजवान फौज में भरती हुए उनमें आठ लाख औरतें थीं, जिनकी उम्र 15-16 साल के बीच थी।

यह किताब इन्हीं औरतों के बारे में जानकारी जुटाती है, जिसमें गहरा सबक़ है। मसलन किताब में बताया गया है कि जंग के बाद ज़्यादातर औरतों ने इस हक़ीक़त को छुपाना शुरू किया कि वे जंग में शरीक हुई थीं। "हमने चाहा कि दोबारा आम लड़कियों की तरह हो जाएं, शादी के क़ाबिल लड़कियां।

> We wanted to become ordinary girls again.
> Marriageable girls.

किताब की लेखिका जंग में शरीक होने वाली एक पढ़ी-लिखी महिला से मिलीं, जिनका नाम वेरा सफमोवना डोडवा (Vera Safrmovna Davdova) था। उन्होंने जो बातें कहीं उनमें से एक बात किताब के के मुताबिक यह थी कि वह यक़ीन रखती हैं कि जंग में औरतों की प्रतिक्रिया पूरी तरह मर्दों से अलग थी। मर्दों का फ़ैसला किसी तजुर्बे के बारे में ज़्यादा आकस्मिक और ज़्यादा यथार्थवादी होता था, जबकि औरतें बहुत ज़्यादा जज़्बाती और भावुक अन्दाज़ में अपना रद्देअमल दिखाती थीं:

दूसरे को इल्म देना उस वक़्त मुमकिन होता है जबकि आदमी दूसरे की भलाई चाहने वाला, उसका खैरख्वाह बन जाए। इसके लिए आदमी को दूसरे का दर्द अपने सीने में महसूस करना पड़ता है। दूसरे को पाने वाला बनाने के लिए अपने आपको न पाने पर राज़ी करना पड़ता है। अपनी बात को दूसरे की नज़र में क़ाबिले- क़ुबूल (स्वीकार्य) बनाने के लिए अपने आपको दूसरे के मुक़ाम पर खड़ा करना पड़ता है। अपने और दूसरे के बीच सुनने और सुनाने की माहौल बनाने की ख़ातिर एकतरफ़ा तौर पर उन तमाम झगड़ों को ख़त्म कर देना पड़ता है जो दोनों के बीच की सामान्य फ़िज़ा को नष्ट किए हुए हों।

इल्म का सदक़ा सबसे बड़ी कुर्बानी की क़ीमत पर दिया जाता है। यह देना उस वक़्त मुमकिन होता है जबकि आदमी ख़ुद को पीछे करने पर तैयार हो जाए। इस दुनिया में देने वाला बनने के लिए खोने वाला बनना पड़ता है। चूंकि लोग खोने वाला बनने के लिए तैयार नहीं होते, इसलिए वे देने वाले भी नहीं बनते।

अल्लाह के यहाँ घमंड की माफ़ी नहीं

सुफ़यान सौरी (रह०) ने कहा: "जो गुनाह मन की इच्छा से मजबूर होकर होता है, उसकी माफ़ी की उम्मीद रहती है। लेकिन जो गुनाह घमंड से होता है, उसकी माफ़ी की उम्मीद नहीं। क्योंकि इब्लीस का गुनाह घमंड से था और आदम की ग़लती इच्छा से थी।

आदम को तौबा के बाद माफ़ कर दिया गया, लेकिन इब्लीस हमेशा के लिए रहमत से दूर कर दिया गया।" (नसाइहुल-इबाद, इब्न हजर अस्क़लानी, बाबुस्सनाई, पृ० 11)

रसूल, मैंने एक औरत से निकाह कर लिया है, (सहीह अल-बुख़ारी, हदीस संख्या 2048)

इस वाक्ये से मालूम होता है कि हज़रत अब्दुर्रहमान बिन औफ़ हालांकि मदीने में थे मगर उन्होंने अपने निकाह में कोई धूम-धाम नहीं की। यहां तक कि रसूलुल्लाह को और अपने क़रीबी साथियों को भी शादी में नहीं बुलाया। सादा तौर पर महज़ ईजाबो-कुबूल के ज़रिए निकाह कर लिया। और तयशुदा महर अदा करके दाम्पत्य जीवन गुज़ारने लगे।

इल्म का सदक़ा

रसूलुल्लाह (सल्ल०) ने फ़रमाया कि सबसे अच्छा सदक़ा (दान) है कि मुसलमान एक इल्म सीखे, फिर उसको अपने भाइयों को सिखाए। (सुनन इब्न माजा, हदीस संख्या 243)

सदका क्या है? सदक़ा दरअसल उस खैरख़्वाही का नाम है, जो एक भाई की तरफ़ से अपने दूसरे भाई के लिए ज़ाहिर होती है। इस खैरख्वाही का इज़हार कभी माल की सूरत में होता है कभी एक अच्छी नसीहत की सूरत में और कभी किसी दूसरी सूरत में खैरख़्वाही इन्सान के सीने में जारी होने वाला रब्बानी चश्मा है और इल्म का सदक़ा इस रब्बानी सरचश्मे का बाहर निकलना है।

इल्म (सच्चाई की पहचान) बेशक इस कायनात (सृष्टि) की सबसे बड़ी चीज़ है। और यही वजह है कि इल्म सबसे बड़ा सदक़ा (दान) है। आसमान के नीचे जो कुछ भी होता है, उनमें सबसे अद्भुत यह है कि इंसान किसी दूसरे के हित के लिए व्याकुल हो और उसे वह हक़ पहुँचा दे जो उसे स्वयं अल्लाह से प्राप्त हुआ है।

रसूलुल्लाह (सल्ल०) को कुछ ख़ास मसलहतों की बिना पर कई निकाह की इजाज़त थी। आपने अलग-अलग वक़्तों में ग्यारह निकाह किया। नौ बीवियां आप की वफ़ात के वक़्त मौजूद थीं। इनमें से किसी भी निकाह के मौके पर किसी भी किस्म की कोई नुमाइशी बात नहीं की गई। मसलन आप की एक बीवी सौदा बिन्त ज़म्आ थीं। हज़रत ख़दीजा की वफ़ात के बाद मक्का में उनके साथ आपका निकाह हुआ। हज़रत सौदा विधवा थीं। आपकी तरफ़ से ख़ौला बिन्त हकीम निकाह का पैग़ाम लेकर गईं। उन्होंने पहले सौदा से इसका ज़िक्र किया। सौदा ने कहा कि अगर मेरा बाप राज़ी हो तो मुझे कोई एतराज़ नहीं। तब ख़ौला ने सौदा के बाप से बातचीत की। उन्होंने इस रिश्ते के लिए 'हां' कर दी। इसके बाद आप सौदा बिन्त ज़म्आ के मकान पर गए और वहां सादा तौर पर निकाह पढ़ा दिया गया।

रसूलुल्लाह के सहाबा (साथियों) का तरीक़ा भी हमेशा यही रहा। यहां तक कि सहाबा में जो लोग मालदार थे, उन्होंने भी हमेशा सादा और बेखर्च अन्दाज़ में निकाह किया। मिसाल के तोर पर हज़रत अब्दुर्रहमान बिन औफ़ एक व्यापारी थे। वह उन चंद सहाबा में थे, जो मालदार माने जाते थे। उन्होंने मदीना में एक ख़ातून से निकाह किया।

इमाम अहमद ने हज़रत अनस के वास्ते से नक़्ल किया है कि हज़रत अब्दुर्रहमान बिन औफ़ का भाईचारा मदीने में एक ऐसे मुसलमान के साथ था जो बहुत मालदार थे। उन्होंने अपने आधे माल की पेशकश की। लेकिन अब्दुर्रहमान बिन औफ़ ने उनके माल में से कुछ नहीं लिया। उन्होंने मदीने में कारोबार शुरू कर दिया। यहां तक कि वह खुद एक मालदार शख़्स हो गए।

हज़रत अब्दुर्रहमान बिन औफ़ एक रोज़ रसूलुल्लाह (सल्ल०) की मजलिस में आए तो उनके कपड़े पर खूश्बू का असर था। रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने फ़रमाया, "क्या बात है?" उन्होंने कहा, "ऐ ख़ुदा के

निकाह के अरकान और शर्तों के बारे में 'फिक्ह' के बीच कुछ शब्दिक मतभेद पाए जाते हैं। उन्हें छोड़ दिया जाए तो अस्ल यह है कि इस्लामी निकाह सिर्फ़ दोनों के ईजाबो- कुबूल से यानी दोनों के क़ुबूल करने से हो जाता है, बशर्ते कि इसका ऐलान भी किया गया हो, और निकाह करने वाले मर्द ने निकाह करने वाली औरत को जरूरी महर अदा कर दी हो। इससे अन्दाज़ा किया जा सकता है कि इस्लाम में निकाह और शादी का मामला कितना ज़्यादा सादा और सहज है।

मगर मौजूदा ज़माने में मुस्लिम शादियों में ऐसे ग़लत रिवाज शामिल हो गए हैं, जिन्होंने एक जायज़ काम को नाजायज़ काम में तबदील कर दिया है। एक यह कि शादी को ख़ानदानी सम्मान का मसला समझा जाता है। इसके नतीजे में निकाह का सादा इस्लामी आयोजन बनावटी धूम और बेजा नुमाइश की चीज बन गया है। इस धूम और नुमाइश को क़ायम रखने के लिए लोग लुट जाते हैं। जायदादें बेच देते हैं और हमेशा के लिए क़र्ज़ की लानत में फंस जाते हैं। एक दिन की धूमधाम के दिखावे की खातिर वह अपनी पूरी ज़िन्दगी को बे-धूम बना लेते हैं।

ये तमाम चीज़ें सरासर ग़ैर-इस्लामी है हैं। हक़ीक़त यह है कि निकाह का आयोजन बेहद सादा और बेखर्च होना चाहिए। वह ऐसा होना चाहिए जैसे नमाज़ का वक़्त आया और आदमी ने मसजिद में जाकर नमाज़ पढ़ ली। निकाह और शादी को एक संजीदा कर्तव्य की अदायगी का दिन होना चाहिए, न कि निजी या खानदानी शानो शौकत के इज़हार का दिन।

हज़रत आयशा से रिवायत है कि रसूलुल्लाह (सल्ल०) ने फरमायाः

बेशक सब से ज़्यादा बरकत वाला निकाह वह है जो सबसे ज़्यादा हल्का और कम खर्च हो, (मुसनद अहमद, हदीस संख्या 24529)

इस्लामी निकाह

निकाह औरत और मर्द के बीच एक समझौता है। यह समझौता पवित्र भी है और स्थायी भी। इस मौक़े पर मर्द की तरफ़ से औरत को जो महर दी जाती है, वह मुआवज़ा या क़ीमत नहीं है, वह दरअस्ल एक प्रतीक राशि (token money) है। महर के रूप में मर्द एक प्रतीक - राशि अदा करके इस बात का प्रण करता है कि वह निकाह की तमाम दीनी और इन्सानी ज़िम्मेदारियों को निभाएगा। दीन के मुताबिक़ महर की मात्रा ऐसी होनी चाहिए, जिसका अदा करना आसान हो।

महर की ज़िम्मेदारी मर्द पर डालने की वजह यह है कि मर्द ज़्यादा ताक़तवर है। इसलिए मेहर की ज़िम्मेदारी मर्द (सिन्फे-क़वी) पर डाली गई, ताकि उसको उसकी खास ज़िम्मेदारी याद दिलाई जाए।

हज़रत अनस बिन मालिक मशहूर सहाबी हैं। वह कहते हैं कि रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने फ़रमाया कि बन्दे ने जब निकाह किया तो उसने आधे दीन पर अमल कर लिया। तो उसको चाहिए कि वह बाक़ी आधे दीन में अल्लाह से डरे। (शुअबुल ईमान, हदीस संख्या 5487)

इस हदीस की रोशनी में जायज़ा लीजिए तो मालूम होगा कि मौजूदा ज़माने के मुसलमान निकाह और दाम्पत्य ज़िन्दगी के मामले में सिर्फ़ आधे दीन की हद तक दीनदार हैं। बाक़ी आधे दीन के मामले में वे बेदीन बने हुए हैं। इन ग़ैर-दीनी तरीक़ों में से, एक घृणित चीज़ वे फिजूलखर्ची वाली रस्में हैं, जो शादी के मौक़े पर रिवाज के तौर पर ज़रूरी बन गई हैं। इन ग़लत रस्मों ने मौजूदा ज़माने में बेशुमार ख़ानदानों को एक तरह की सामाजिक यातना में फंसा दिया हैं।

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

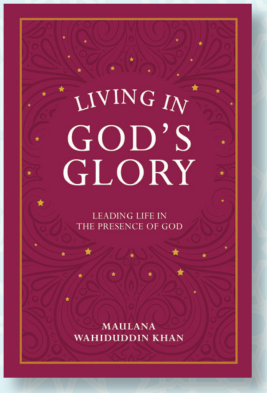

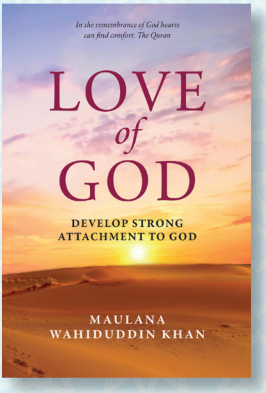

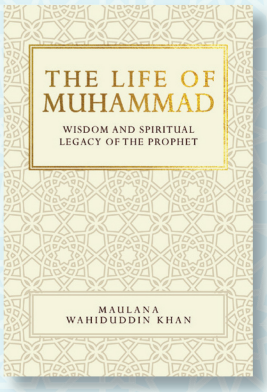

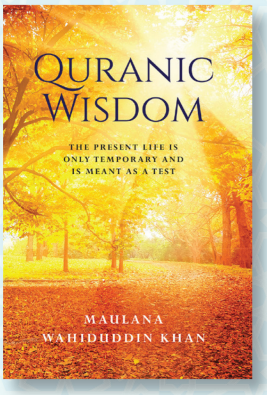

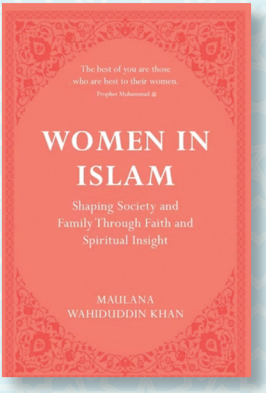

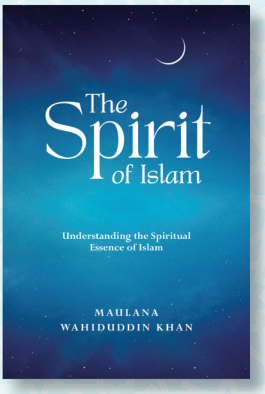

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23